

*

188443

*

*

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. 94544E/10-00 Accession No. 108
Author یاشور - لیل G.108
Title تاریخ سیرت - جلد اول

This book should be returned on or before the date last marked below.

*

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

تاریخ ہند

کتاب اول
(برائے ان ٹرمی ڈیٹ)

مؤلفہ

مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی

رکن سرشتہ تالیف و ترجمہ

جامعہ عثمانیہ

۳۳۸ ق م (۳۲۹ ق م) ۲۰ ۱۹۶۱ء

عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ

مُقَدِّمَةٌ



دنیا میں ہر قوم کی زندگی میں ایک ایسا زمانہ آتا ہے جب کہ اُس کے قوائے ذہنی میں انحطاط کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں ، ایجاد و اختراع اور غور و فکر کا مادہ تقریباً مفقود ہو جاتا ہے ، تخیل کی پرواز اور نظر کی جولانی تنگ اور محدود ہو جاتی ہے ، علم کا دار و مدار چند رسمی باتوں اور تقلید پر رہ جاتا ہے ۔ اُس وقت قوم یا تو بیکار اور مردہ ہو جاتی ہے یا سنبھلنے کے لئے یہ لازم ہوتا ہے کہ وہ دوسری ترقی یافتہ اقوام کا اثر قبول کرے ۔ تاریخ عالم کے ہر دور میں اس کی شہادتیں موجود ہیں ۔ خود ہمارے دیکھتے دیکھتے جاچان پر یہی گزری اور یہی حالت اب ہندوستان کی ہے ۔ جس طرح کوئی شخص دوسرے بنی نوع انسان سے قطع تعلق کر کے تنہا اور الگ تھلک نہیں رہ سکتا اور اگر رہے تو پنپ

نہیں سکتا اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ کوئی قوم دیگر اقوام عالم سے بے نیاز ہو کر پھولے پھلے اور ترقی پائے۔ جس طرح ہوا کے جھونکے اور ادنیٰ پرندوں اور کیڑے کوڑوں کے اثر سے وہ مقامات تک ہرے بھے رہتے ہیں جہاں انسان کی دسترس نہیں اسی طرح انسانوں اور قوموں کے اثر بھی ایک دوسرے تک اڑ کر پہنچتے ہیں۔ جس طرح یونان کا اثر روم اور دیگر اقوام یورپ پر پڑا جس طرح عرب نے عجم کو اور عجم نے عرب کو اپنا فیض پہنچایا، جس طرح اسلام نے یورپ میں تاریکی اور جہالت کو مٹا کر علم کی روشنی پہنچائی اسی طرح آج ہم بھی بہت سی باتوں میں مغرب کے محتاج ہیں۔ یہ قانون عالم ہے جو یوں ہی جاری رہا اور جاری رہیگا۔

”دن سے دیا یوں ہی جلتا رہا ہے“

جب کسی قوم کی نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے اور وہ آگے قدم بڑھانے کی سعی کرتی ہے تو ادبیات کے میدان میں پہلی منزل ترجمہ ہوتی ہے۔ اس لئے کہ جب قوم میں جدت اور ایج نہیں رہی تو ظاہر ہے کہ اس کی تصانیف معمولی ادھوری، کم مایہ اور ادنیٰ ہونگی۔ اُس وقت قوم کی بڑی خدمت یہی ہے کہ ترجمہ کے ذریعہ سے دنیا کی اعلیٰ درجہ کی تصانیف اپنی زبان میں لائی جائیں۔ یہی ترجمے خیالات میں تغیر اور معلومات میں اضافہ کہیں گے، جمود کو توڑیں گے اور قوم میں ایک نئی حرکت پیدا کہیں گے اور پھر آخر یہی ترجمے تصنیف و تالیف

کے جدید اسلوب اور ڈھنگ سمجھائیں گے۔ ایسے وقت میں ترجمہ تصنیف سے زیادہ قابل قدر، زیادہ مفید اور زیادہ فیض رساں ہوتا ہے۔

اسی اصول کی بنا پر جب عثمانیہ یونیورسٹی کی تجویز پیش ہوئی تو ہزار اکڑ الٹ ڈائینس رستم دوراں ارسطوئے زماں سے سالار آصف جاہ مظفر الممالک نظام الملک نظام الدولہ **نَوَابِ صِيْرُ عُمَانٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَتْحُ جَنَاحِ** جی۔سی۔اس۔آئی۔جی۔سی۔بی۔ای۔والی حیدرآباد دکن خلد اللہ ملکہ و سلطنت نے جن کی علمی قدر دانی اور علمی سرپرستی اس زمانہ میں ایسے علوم کے حق میں آب حیات کا کام کر رہی ہے، یہ تقاضائے مصلحت و دور بینی سب سے اول سررشتہ تالیف و ترجمہ کے قیام کی منظوری عطا فرمائی جو نہ صرف یونیورسٹی کے لئے نصاب تعلیم کی کتابیں تیار کریں گے بلکہ ملک میں نشر و اشاعت علوم و فنون کا کام بھی انجام دیگا۔ اگرچہ اس سے قبل بھی یہ کام ہندوستان کے مختلف مقامات میں تھوڑا تھوڑا انجام پایا مثلاً فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں زیر نگرانی ڈاکٹر گلکرسٹ، دہلی سوسائٹی میں 'ابن پنجاب میں زیر نگرانی ڈاکٹر لائٹنر و کرنل ہارلاند، علی گڑھ سائنٹفک انسٹیٹیوٹ میں جس کی بنا سر سید احمد خاں مرحوم نے ڈالی۔ مگر یہ کوششیں سب وقتی اور عارضی تھیں۔ نہ ان کے پاس کافی سرمایہ اور سامان تھا نہ انہیں یہ موقع حاصل تھا

اور نہ انہیں **اَعْلَمَ حَضْرَتِ وَاَقْلَسَ** جیسے علم پرورد
 فرمانروا کی سرپرستی کا شرف حاصل تھا۔ یہ پہلا وقت ہے کہ
 اردو زبان کو علوم و فنون سے مالا مال کرنے کے لئے باقاعدہ
 اور مستقل کوشش کی گئی ہے۔ اور یہ پہلا وقت ہے کہ
 اردو زبان کو یہ رتبہ ملا ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ قرار
 پائی ہے۔ اسی لئے علوم کے لئے جو کام آگسٹس نے روم میں
 خلافت عباسیہ میں ہارون الرشید و مامون الرشید نے ہسپانیہ میں
 عبدالرحمن ثالث نے، بکرماجیت و اکبر نے ہندوستان میں
 الفرڈ نے انگلستان میں، پیٹر اعظم و کیتھرائن نے روس میں
 اور مت شی ہٹونے جاپان میں کیا، وہی فرمانروا نے دولت
اَصْفِيَه نے اس ملک کے لئے کیا۔ **اَعْلَمَ حَضْرَتِ وَاَقْلَسَ**
 کا یہ کارنامہ ہندوستان کی علمی تاریخ میں ہمیشہ فخر و مباہات
 کے ساتھ ذکر کیا جائیگا۔

منجملہ اُن اسباب کے جو قومی ترقی کا موجب ہوتے ہیں ایک
 بڑا سبب زبان کی تکمیل ہے۔ جس قدر جو قوم زیادہ ترقی یافتہ
 ہے اسی قدر اُس کی زبان وسیع اور اس میں نازک خیالات
 اور علمی مطالب کے ادا کرنے کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے،
 اور جس قدر جس قوم کی زبان محدود ہوتی ہے اسی قدر تہذیب
 و شایستگی بلکہ انسانیت میں اس کا درجہ کم ہوتا ہے۔ چنانچہ
 وحشی اقوام میں الفاظ کا ذخیرہ بہت ہی کم پایا گیا ہے۔ علمائے
 فلسفہ و علم اللسان نے یہ ثابت کیا ہے کہ زبان، خیال اور

خیال، زبان ہے اور ایک مدت کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انسانی دماغ کے صحیح تاریخی ارتقا کا علم، زبان کی تاریخ کے مطالعہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ الفاظ ہمیں سوچنے میں ویسی ہی مدد دیتے ہیں جیسی آنکھیں دیکھنے میں۔ اس لئے زبان کی ترقی درحقیقت عقل کی ترقی ہے۔

علم ادب اسی قدر وسیع ہے جس قدر حیات انسانی۔ اور اس کا اثر زندگی کے ہر شعبہ پر پڑتا ہے۔ وہ نہ صرف انسان کی ذہنی، معاشرتی، سیاسی ترقی میں مدد دیتا، اور نظر میں سوت کی دماغ میں روشنی، دلوں میں حرکت اور خیالات میں تغیر پیدا کرتا ہے بلکہ قوموں کے بنانے میں ایک قوی آلہ ہے۔ قومیت کے لئے ہم خیالی شرط ہے اور ہم خیالی کے لئے ہم زبانی لازم۔ گویا ایک زبانی قومیت کا شیرازہ ہے جو اسے منتشر ہونے سے بچائے رکھتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب کہ مسلمان اقطاع عالم میں پھیلے ہوئے تھے لیکن ان کے علم ادب اور زبان نے انہیں ہر جگہ ایک کر رکھا تھا۔ اس زمانے میں انگریز ایک دنیا پر چھائے ہوئے ہیں لیکن باوجود بُعد مسافت و اختلاف ممالک ایک زبانی کی بدولت قومیت کے ایک سلسلے میں منسلک ہیں، زبان میں جادو کا سا اثر ہے اور صرف افراد ہی پر نہیں بلکہ اقوام پر بھی اُس کا وہی تسلط ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تعلیم کا صحیح اور فطرتی ذریعہ اپنی ہی زبان ہو سکتی ہے۔ اس امر کو اعلیٰ حضرت و اقل س نے

پچانا اور جامعہ عثمانیہ کی بنیاد ڈالی۔ جامعہ عثمانیہ ہندوستان میں پہلی یونیورسٹی ہے جس میں ابتدا سے انتہا تک ذریعہ تعلیم ایک دیسی زبان ہوگا۔ اور یہ زبان اردو ہوگی۔ ایک ایسے ملک میں جہاں ”ہانت ہانت کی بولیاں“ بولی جاتی ہیں، جہاں ہر صوبہ ایک نیا عالم ہے، صرف اردو ہی ایک عام اور مشترک زبان ہو سکتی ہے۔ یہ اہل ہند کے میل جول سے پیدا ہوئی اور اب بھی یہی اس فرض کو انجام دیگی۔ یہ اس کے خمیر اور وضع و ترکیب میں ہے۔ اس لئے یہی تعلیم اور تبادلہ خیالات کا واسطہ بن سکتی اور قومی زبان کا دعوئے کر سکتی ہے۔

جب تعلیم کا ذریعہ اردو قرار دیا گیا تو یہ کھلا اعتراض تھا کہ اردو میں اعلیٰ تعلیم کے لئے کتابوں کا ذخیرہ کہاں ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا جاتا تھا کہ اردو میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ اس میں علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم ہو سکے۔ یہ صحیح ہے کہ اردو میں اعلیٰ تعلیم کے لئے کافی ذخیرہ نہیں۔ اور اردو ہی پر کیا منحصر ہے، ہندوستان کی کسی زبان میں بھی نہیں۔ یہ طلب و رسد کا عام مسئلہ ہے۔ جب مانگ ہی نہ تھی تو رسد کہاں سے آتی۔ جب ضرورت ہی نہ تھی تو کتابیں کیوں مگر مینا ہوتیں۔ ہماری اعلیٰ تعلیم غیر زبان میں ہوتی تھی، تو علوم و فنون کا ذخیرہ ہماری زبان میں کہاں سے آتا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ اب ضرورت محسوس ہوئی ہے تو کتابیں بھی

میتا ہو جائیں گی۔ اسی کمی کو پورا کرنے اور اسی ضرورت کو رفع کرنے کے لئے سررشتہ تالیف و ترجمہ قائم کیا گیا۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ اردو زبان میں اس کی صلاحیت نہیں۔ اس کے لئے کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں۔ سررشتہ تالیف و ترجمہ کا وجود اس کا شافی جواب ہے۔ یہ سررشتہ ہی کام کر رہا ہے۔ کتابیں تالیف و ترجمہ ہو رہی ہیں اور چند روز میں عثمانیہ یونیورسٹی کالج کے طالب علموں کے ہاتھوں میں ہونگی اور رفتہ رفتہ عام شایقین علم تک پہنچ جائیں گی۔

لیکن اس میں سب سے کٹھن اور سنگلاخ مرحلہ وضع اصطلاحات کا تھا۔ اس میں بہت کچھ اختلاف اور بحث کی گنجائش ہے۔ اس بارے میں ایک مدت کے تجربہ اور کامل غور و فکر اور مشورہ کے بعد میری یہ رائے قرار پائی ہے کہ تنہا نہ تو ماہر علم صحیح طور سے اصطلاحات وضع کر سکتا ہے اور نہ ماہر لسان۔ ایک کو دوسرے کی ضرورت ہے۔ اور ایک کی کمی دوسرا پورا کرتا ہے۔ اس لئے اس اہم کام کو صحیح طور سے انجام دینے کے لئے یہ ضروری ہے کہ دونوں یک جا جمع کئے جائیں تاکہ وہ ایک دوسرے کے مشورہ اور مدد سے ایسی اصطلاحات بنائیں جو نہ اہل علم کو ناگوار ہوں نہ اہل زبان کو۔ چنانچہ اسی اصول پر ہم نے وضع اصطلاحات کے لئے ایک ایسی مجلس بنائی جس میں دونوں جماعتوں کے اصحاب شریک ہیں۔ علاوہ ان کے

ہم نے اُن اہل علم سے بھی مشورہ کیا جو اس کی خاص اہلیت رکھتے ہیں اور بُعد مسافت کی وجہ سے ہماری مجلس میں شریک نہیں ہو سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض الفاظ غیر مانوس معلوم ہوں گے اور اہل زبان انہیں دیکھ کر ناک بہوں چڑھائیں گے۔ لیکن اس سے گزیر نہیں۔ ہمیں بعض ایسے علوم سے واسطہ ہے جن کی ہوا تک ہماری زبان کو نہیں لگی۔ ایسی صورت میں سوانے اس کے چارہ نہیں کہ جب ہماری زبان کے موجودہ الفاظ خاص خاص مفہوم کے ادا کرنے سے قاصر ہوں تو ہم جدید الفاظ وضع کریں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم نے محض ٹالنے کے لئے زبردستی الفاظ گھڑ کر رکھ دئے ہیں بلکہ جس نچ پر اب تک الفاظ بنتے چلے آئے ہیں اور جن اصول ترکیب و اشتقاق پر اب تک ہماری زبان کار بند رہی ہے، اس کی پوری پابندی ہم نے کی ہے۔ ہم نے اُس وقت تک کسی لفظ کے بنانے کی جرأت نہیں کی جب تک اُسی قسم کی متعدد مثالیں ہمارے پیش نظر نہ رہی ہوں۔ ہماری رائے میں جدید الفاظ کے وضع کرنے کی اس سے بہتر اور صحیح کوئی صورت نہیں۔ اب اگر کوئی لفظ غیر مانوس یا اجنبی معلوم ہو تو اس میں ہمارا قصور نہیں۔ جو زبان زیادہ تر شعر و شاعری اور قصص تک محدود ہو، وہاں ایسا ہونا کچھ تعجب کی بات نہیں۔ جس ملک سے ایجاد و اختراع کا مادہ سلب ہو گیا ہو جہاں لوگ نئی چیزوں کے بنانے اور دیکھنے کے عادی نہ ہوں، وہاں جدید الفاظ کا

غیر مانوس اور اجنبی معلوم ہونا موجب حیرت نہیں۔ الفاظ کی حالت بھی انسانوں کی سی ہے۔ اجنبی شخص بھی رفتہ رفتہ مانوس ہو جاتے ہیں۔ اول اول الفاظ کا بھی یہی حال ہے۔ استعمال آہستہ آہستہ غیر مانوس کو مانوس کر دیتا ہے اور صحت و غیرہ صحت کا فیصلہ زمانہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ لفظ تجویز کرتے وقت ہر پہلو پر کامل غور کر لیں، آئندہ چل کر اگر وہ استعمال اور زمانہ کی کسوٹی پر پورا اترتا تو خود ٹکسالی ہو جائیگا اور اپنی جگہ آپ پیدا کر لیگا۔ علاوہ اس کے جو الفاظ پیش کئے گئے ہیں وہ الہامی نہیں کہ جن میں رد و بدل نہ ہو سکے، بلکہ فرہنگ اصطلاحات عثمانیہ جو زیر ترتیب ہے پہلے اس کا مسودہ اہل علم کی خدمت میں پیش کیا جائے گا اور جاں تک ممکن ہوگا اس کی اصلاح میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا جائے گا۔

لیکن ہماری مشکلات صرف اصطلاحات علمیہ تک ہی محدود نہیں ہیں۔ ہمیں ایک ایسی زبان سے ترجمہ کرنا پڑتا ہے جو ہمارے لئے بالکل اجنبی ہے، اس میں اور ہماری زبان میں کسی قسم کا کوئی رشتہ یا تعلق نہیں۔ اس کا طرز بیان، ادائے مطلب کے اسلوب، محاورات وغیرہ بالکل جدا ہیں۔ جو الفاظ اور جملے انگریزی زبان میں بالکل معمولی اور روزمرہ کے استعمال میں آتے ہیں، اُن کا ترجمہ جب ہم اپنی زبان میں کرنے بیٹھتے ہیں تو سخت دشواری پیش آتی ہے۔ ان تمام دشواریوں پر

غالب آنے کے لئے مترجم کو کیسا کچھ خون جگر کھانا نہیں پڑتا۔ ترجمہ کا کام، جیسا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے، کچھ آسان کام نہیں ہے۔ بہت خاک چھانی پڑتی ہے تب کہیں گوہر مقصود ہاتھ آتا ہے + اس سررشتہ کا کام صرف یہی نہ ہوگا (اگرچہ یہ اس کا فرض اولین ہے) کہ وہ نصاب تعلیم کی کتابیں تیار کرے، بلکہ اس کے علاوہ وہ ہر علم پر متعدد اور کثرت سے کتابیں تالیف و ترجمہ کرائے گا، تاکہ لوگوں میں علم کا شوق بڑھے، ملک میں روشنی پھیلے، خیالات و قلوب پر اثر پیدا ہو، جمالت کا استیصال ہو۔ جمالت کے معنی اب لاعلمی ہی کے نہیں بلکہ اس میں افلاس، کم ہمتی، تنگ دلی، کوتاہ نظری، بے غیرتی، بد اخلاقی سب کچھ آجاتا ہے۔ جمالت کا مقابلہ کر کے اسے پس پا کر ناسب سے بڑا کام ہے۔ انسانی دماغ کی ترقی علم کی ترقی ہے۔ انسانی ترقی کی تاریخ علم کی اشاعت و ترقی کی تاریخ ہے۔ ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک انسان نے جو کچھ کیا ہے، اگر اس پر ایک وسیع نظر ڈالی جائے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ جوں جوں علم میں اضافہ ہوتا گیا، پچھلی غلطیوں کی صحت ہوتی گئی، تاریکی گھٹتی گئی، روشنی بڑھتی گئی، انسان میدان ترقی میں قدم آگے بڑھاتا گیا۔ اسی مقدس فرض کے ادا کرنے کے لئے یہ سررشتہ قائم کیا گیا ہے اور وہ اپنی بساط کے موافق اس کے انجام دینے میں کوتاہی نہ کرے گا۔

لیکن غلطی، تحقیق و جستجو کی گھات میں لگی رہتی ہے۔ ادب کا

کال ذوق سلیم ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا۔ بڑے بڑے نقاد اور مبصر فاش غلطیاں کر جاتے ہیں۔ لیکن اس سے ان کے کام پر حرف نہیں آتا۔ غلطی ترقی کے مانع نہیں ہے، بلکہ وہ صحت کی طرف رہنمائی کرتی ہے پچھلوں کی بھول چوک آنے والے مسافر کو رستہ بھٹکنے سے بچا دیتی ہے۔ ایک جاپانی ماہر تعلیم (بیرن کی کوچی) نے اپنے ملک کا تعلیمی حال لکھتے ہوئے اس صحیح کیفیت کا ذکر کیا ہے جو ہونہار اور ترقی کرنے والے افراد اور اقوام پر گزرتی ہے۔

”ہم نے بہت سے تجربے کئے اور بہت سی ناکامیاں اور غلطیاں ہوئیں، لیکن ہم نے ان سے نئے سبق سیکھے اور فائدہ اٹھایا۔ رفتہ رفتہ ہمیں اپنے ملک کی تعلیمی ضروریات اور امکانات کا صحیح اور بہتر علم ہوتا گیا اور ایسے تعلیمی طریقے معلوم ہوتے گئے جو ہمارے اہل وطن کے لئے زیادہ موزوں تھے۔ ابھی بہت سے ایسے مسائل ہیں جو ہمیں حل کرنے میں بہت سی ایسی اصلاحیں ہیں جو ہمیں عمل میں لانی ہیں، ہم نے اب تک کوشش کی اور ابھی کوشش کر رہے ہیں اور مختلف طریقوں کی برائیاں اور بھلائیاں دریافت کرنے کے درپے ہیں، تاکہ اپنے ملک کے فائدے کے لئے اچھی باتوں کو اختیار کریں اور رواج دیں اور برائیوں سے بچیں۔ اس لئے جو حضرات ہمارے کام پر تنقیدی نظر ڈالیں انہیں وقت کی تنگی، کام کا ہجوم اور اس کی اہمیت اور ہماری مشکلات پیش نظر رکھنی چاہئیں۔ یہ پہلی سہی ہے اور پہلی سہی میں کچھ نہ کچھ خامیاں

ضرور رہ جاتی ہیں، لیکن آگے چل کر یہی خامیاں ہماری رہنما بنیں گی اور پختگی اور اصلاح تک پہنچائیں گی۔ یہ نقش اول ہے، نقش ثانی اس سے بہتر ہوگا۔ ضرورت کا احساس علم کا شوق، حقیقت کی لگن، صحت کی ٹوہ، جدوجہد کی رسائی خود بخود ترقی کے مارج طے کر لے گی۔

جاپانی بڑے فخر سے یہ کہتے ہیں کہ ہم نے تیس چالیس سال کے عرصے میں وہ کچھ کر دکھایا جس کے انجام دینے میں یورپ کو اتنی ہی صدیاں صرف کرنی پڑیں۔ کیا کوئی دن ایسا آئے گا کہ ہم بھی یہ کہنے کے قابل ہوں گے؟ ہم نے پہلی شرط پوری کر دی ہے یعنی بیجا قیود سے آزاد ہو کر اپنی زبان کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ لوگ ابھی ہمارے کام کو تذبذب کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں اور ہماری زبان کی قابلیت کی طرف مشتتبہ نظریں ڈال رہے ہیں۔ لیکن وہ دن آنے والا ہے کہ اس ڈرے کا بھی ستارہ چمکے گا، یہ زبان علم و حکمت سے مالا مال ہوگی اور

اَعْلَمُ حَضْرَتِ وَاَقْلَمُ کی نظر کیسا اثر کی بدولت یہ دنیا کی مذہب و شایستہ زبانوں کی ہمسری کا دعوے کرے گی۔ اگرچہ اُس وقت ہماری سعی اور محنت حقیر معلوم ہوگی، مگر یہی شامِ غربت صبحِ وطن کی آمد کی خبر دے رہی ہے، یہی شبِ بیدارِ روزِ روشن کا جلوہ دکھائیں گی، اور یہی مشقت اُس قصرِ رفیع الشان کی بنیاد ہوگی جو آئندہ تعمیر ہونے والا ہے۔

اِس وقت ہمارا کام صبر و استقلال سے میدان صاف کرنا،

داغ بیل ڈالنا اور نیو کھودنا ہے، اور فرلاد وار شیرین حکمت کی خاطر سنگلخ پہاڑوں کو کھود کھود کر جوئے علم لانے کی سعی کرتا ہے۔ اور گو ہم نہ ہوں گے مگر ایک زمانہ آئیگا جب کہ اس میں علم و حکمت کے دریا بہیں گے اور ادبیات کی افتادہ زمین سرسبز و شاداب نظر آئے گی۔

آخر میں میں سررشتہ کے مترجمین کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اپنے فرض کو بڑی مستعدی اور شوق سے انجام دیا۔ نیز میں ارکان مجلس وضع اصطلاحات کا شکر گزار ہوں کہ ان کے مفید مشورے اور تحقیق کی مدد سے یہ مشکل کام بخوبی انجام پا رہا ہے۔ لیکن خصوصیت کے ساتھ یہ سررشتہ جناب مسٹر محمد اکبر حیدری بی۔ اے معتمد عدالت و تعلیمات و کوٹوالی و امور عامہ سرکار عالی کا ممنون ہے جنہیں ابتدا سے قیام و انتظام جامعہ عثمانیہ میں خاص انعام رہا ہے۔ اور اگر ان کی توجہ اور امداد ہمارے شریک حال نہ ہوتی تو یہ عظیم الشان کام صورت پذیر نہ ہوتا۔ میں سید راس مسعود صاحب بی۔ اے (آکسن) آئی۔ ای۔ ایس۔ ناظم تعلیمات سرکار عالی کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کی توجہ اور عنایت ہمارے حال پر سبذول رہی اور ضرورت کے وقت ہمیشہ بلا تکلف خوشی کے ساتھ ہمیں مدد دی ہے۔

عبدالحق

ناظم سررشتہ، تالیف و ترجمہ (عثمانیہ یونیورسٹی)

ارکان مجلس و تنظیمات

مولوی مرزا مہدی خاں صاحب کوکب وظیفہ یاب سکر علی (سابق ناظم مردم شماری)
 مولوی حمید الدین صاحب بی۔ اے صدر دارالعلوم
 نواب حیدر یار جنگ (مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی)
 مولوی حمید الدین صاحب سلیم
 مولوی عبدالحق بی۔ اے ناظم سررشتہ تالیف و ترجمہ

علاوہ ان مستقل ارکان کے ، متبرمین سررشتہ تالیف و ترجمہ نیز
 دوسرے اصحاب سے بلحاظ انکے فن کے مشورہ کیا گیا۔ مثلاً
 خان فضل محمد خان صاحب ایم۔ اے ریگلر (پرنسپل ٹی ہائی اسکول حیدرآباد)
 مولوی عبدالواسع صاحب (پروفیسر دارالعلوم حیدرآباد)
 پروفیسر عبدالرحمن صاحب برنی۔ ایس۔ سی (نظام کالج)
 مرزا محمد ہادی صاحب بی۔ اے (پروفیسر کرپن کالج لکھنؤ)

مولوی سلیمان صاحب ندوی

سید راس مسعود صاحب بی۔ اے (ناظم تعلیمات حیدرآباد) وغیرہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دیباچہ



جامئہ عثمانیہ کے نصابِ تاریخ کے متعلق تراجم و تالیفات کا کام سر شہ
تالیف و ترجمہ کے سپرد ہے۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں مولوی سید ہاشمی صاحب
رکن شعبہ تالیف و ترجمہ نے طلبائے انٹرمیڈیٹ کے لئے ہندوستان
کی ایک تاریخ لکھنی شروع کی ہے اور اسی تاریخ کا پہلا حصہ یہ کتاب
ہے جس میں ہندو قدیم کے حالات چند مستند انگریزی تصانیف سے
اخذ کر کے بیان کئے گئے ہیں۔

چونکہ اکثر قدیم تاریخی حالات کے متعلق معلومات کا کوئی ذخیرہ یکجا
موجود نہیں ہوتا اس لئے اہل فن کو اپنا گوہر مقصود حاصل کرنے میں
بہت دور دور کی خاک چھاننی پڑتی ہے۔ جن دور افتادہ و منتشر
ماخذوں سے اس فن میں وہ اپنی کتابیں لکھتے ہیں وہ دو قسم کے ہیں
ایک تو ایسے ہیں جو اسی ملک سے دستیاب ہوئے ہیں مثلاً ہندوؤں
کی برائے نام پرانی تاریخیں یا ان کی مذہبی کتابیں و حکایات یا مشہور
شاعروں کا کلام مہابھارت اور رامائن ہیں جن میں مشاہیر قوم کے حالات
نہایت پر شوکت عبارت میں جوش عقیدت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں

یا پرانے راجاؤں کے سکے ہیں جن کے حروف و نقوش سے بادشاہوں کے نام، ان کی مدتِ حکومت اور ان کے تمدن پر غیر ملک والوں کا اثر دریافت کیا جاتا ہے۔ یا آثارِ قدیمہ ہیں جن کی وضع و قطع دیکھ کر یا جن کے کتبوں کی عبارت پڑھ کر بائیانِ تعمیر کے حالات منکشف ہوتے ہیں۔ دوسری قسم کے ماخذ غیر ملک والوں کی تصانیف ہیں۔ اسکی کیفیت یہ ہے کہ میلادِ مسیح علیہ السلام سے کچھ کم چھ سو برس پہلے جب بودھ مذہب پیدا ہو کر ہندوستان کے باہر جنوبی اور مشرقی ملکوں میں شایع ہو گیا تو ان ملکوں سے بالخصوص چین سے اس مذہب کے پیرو ہندوستان میں تیرتھ کے لئے آنے شروع ہوئے کیونکہ یہ ملک بائنی مذہب کا مولد و مسکن تھا۔ نتیجہ کرنے والوں کا یہ سلسلہ مدت تک قائم رہا بلکہ یہ سمجھنا چاہئے کہ اب تک قائم ہے۔ لیکن پانچویں اور پہلی صدی قبل مسیح میں چند لوگ ایسے آئے جنہوں نے اپنے سفرنامے لکھے اور سفرناموں میں اس ملک کے حالات بیان کئے اور یہ نوشتے یا ان کے اجزائے اس زمانہ تک محفوظ رہ کر محققوں کو دستیاب ہو گئے اور ان کو اپنے کام میں مدد مل گئی۔ چینیوں کے علاوہ یونانیوں نے بھی یہاں کے حالات وقتاً فوقتاً قلمبند کئے اور اسکی کیفیت یہ ہوئی کہ گوتم بدھ کی وفات کے تقریباً ڈھائی سو برس بعد ایشیا میں ایک تہلکہ عظیم پیش آیا یعنی بادشاہِ مقدونیہ اسکندر اعظم نے یورپ سے اٹھ کر ایشیا میں ایک وسیع سلطنت قائم کی جس میں ایشیائے کوچک، شام و فلسطین، ایران و خراسان، ترکستان و افغانستان یہاں تک

کہ سندھ و پنجاب بھی شامل کر لئے گئے۔ اس تعلق سے یونانیوں کا گزر ہندوستان میں ہو گیا اور انہوں نے یہاں کے حالات سے واقفیت پیدا کی۔ جو قوت اسکندر کی موت پر اُسکی سلطنت، اُسکے امراءے لشکر میں تقسیم ہوئی تو مغربی ایشیا کی کل سلطنت سلیوقس کے حصہ میں آئی۔ چونکہ فتوحات اسکندری کا تعلق ہندوستان سے ہو گیا تھا پہلے یہاں کے راجاؤں اور یونانیوں میں ملکی تعلقات پیدا ہوئے۔ شام و مصر کے سفیر اس ملک میں وقتاً فوقتاً آئے جن میں سے بعض نے ہندوستان کے حالات میں کتابیں لکھیں اور اس طرح چند صدیوں کے اندر یونانی زبان میں ایک مقبول ذخیرہ ہندوستان کے متعلق معلومات کا پیدا ہو گیا جسکو علمائے مغرب نے اس فن میں ایک بیش بہا سرمایہ سمجھا۔ ان تصانیف کے صدہا سال بعد یعنی گیا رہیں صدی عیسوی میں علامہ ابوریحان بیرونی محمود غزنوی کے ہمراہ ہندوستان میں آیا اور یہاں کے حالات میں اپنی مشہور تصنیف "کتاب الہند" لکھی۔ اور ایسی لکھی کہ ہندو قدیم کی تاریخ میں کوئی تالیف بنیر اس کتاب کے مطالعہ کے قطعی دشوار ہے۔ مؤلف کتاب ہذا نے اُن تمام ماخذوں کو جن سے اس فن میں کتابیں لکھی جاتی ہیں نہایت حسن و ترتیب سے اپنی تالیف میں بیان کیا ہے۔

پہلے تاریخ لکھنے میں جہاں اور مشکلات ہیں ایک یہ بھی ہے کہ واقعات ماضی کو بقید وقت لکھنا جو تاریخ نویسی کی سب سے بڑی شرط ہے اکثر غیر ممکن ہوتا ہے اولاً تو ایک زمانہ ایسا ہوتا ہے کہ جس سے پہلے کے حالات دریافت ہی نہیں ہوتے۔ پھر ایک

زمانہ ایسا آتا ہے کہ واقعات تو بہت سے دریافت ہوتے ہیں لیکن ان کے زمانہ کا ٹھیک پتا نہیں چلتا۔ چنانچہ شمالی ہند کے حالات مسیح علیہ السلام سے پانچ سو ساٹھ برس پہلے کے مطلق دریافت نہیں ہوتے اور اگر کسی نے کچھ لکھے بھی ہیں تو وہ پایہ اعتبار سے ساقط ہیں، محض قصے اور کہانیاں ہیں۔ اب اس زمانہ سے تیسری صدی قبل مسیح تک جس قدر حالات معلوم ہوتے ہیں ان کے زمانوں کا تعین اکثر قیاسی طور پر کیا گیا ہے یعنی کسی ایک واقعہ کے تعلق سے جس کی صحیح تاریخ معلوم ہوگئی ہے باقی واقعات کا زمانہ محض شکل سے لکھ دیا ہے۔ جنوبی ہند کے صحیح حالات کا زمانہ اور بھی بدکا ہے اور اُسکی تاریخیں بھی اکثر قیاسی ہیں۔ بجز ایک تاریخ کے یعنی ۳۲۶ ق۔م کے، جس میں اسکندر نے ہندوستان پر حملہ کیا اور کسی تاریخ کی صحت پر کامل یقین ہونا مشکل ہے۔ مگر باوجود ان مشکلات کے علمائے مغرب نے تحقیق کے میدان میں حقیقت و قیاس کے وہ وہ کہنے دکھائے ہیں کہ ذوقِ علم کی لذت اور اہل فن کی تشنہ دہانی روز بروز زیادہ ہی ہوتی جاتی ہے۔

اس کتاب پر ایک نظر ڈالئے تو معلوم ہوتا ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں شمالی ہندوستان میں جس سے مراد آجکل کا سرحدی علاقہ شمال و مغرب، سندھ و پنجاب، اگردہ و اودھ، بنگال و بہار، صوبہ متوسط ہے ہندوؤں کی بہت سی خود مختار ریاستیں قائم تھیں۔ مثلاً بالکل شمال میں گندھار کی ریاست تھی جسکا پایہ تخت

راولپنڈی کے قریب ملکسلا کا شہر قوم لگا کا بسایا ہوا موجود تھا۔ اسکے جنوب میں جمنائے کے کنارے قوم کورد کی ریاست تھی جس کا راجدھانی اندرپرست کا شہر موجودہ دہلی سے بالکل متصل تھا۔ اسکے مشرق میں پنپال کی قوم صوبہ اودہ اور گنگا و جمنائے کے دوآبہ میں ریاست کرتی تھی۔ اندرپرست کے مغرب میں قوم متسین کا دور دورہ تھا۔ ان ہی سے متصل ایک اور قوم صاحب ریاست سورسین کی تھی جس کا دارالحکومت مدھورا یا متھرا کا شہر جمنائے کے کنارے تھا۔ مانوس میں اونتی قوم کا راج اجین کے شہر میں تھا جس کا نام ابھی تک یہی چلا آتا ہے۔ ایک قوم اجین کی تھی جس کا مقام صوبہ جات متحدہ کے شمالی علاقوں کو سمجھنا چاہئے۔ اسکے مشہور گروہ لچھوی اور والیائی تھے جن کا مستقر حکومت دیسالی کا شہر صوبہ بہار میں مظفر پور کے قریب تھا۔ دیسالی سے شمال مغرب میں ووھیائی کی بڑی ریاست تھی ووھیائی کو کوئی اودہ یا اجیسیا سے تعبیر کرتا ہے اور کوئی ان دونوں علاقوں سے باہر کی ریاست بتاتا ہے۔ اس طرح نیپال کے علاقہ میں گورکھپور سے کسی قدر فاصلہ پر سیراوتی کا شہر تھا جس میں کوسل کی قوم صاحب حکومت تھی۔ مگر ان تمام ریاستوں میں گدہ کی ریاست صوبہ بہار میں سب سے بڑی تھی۔

گدہ راج کا بانی بنارس کا ایک شہزادہ سسین ناگ تھا جو پہلے گیا کے پہاڑی حصوں پر حکومت کرتا تھا۔ اسی راجہ کی اولاد سے پانچویں پشت میں راجہ ہم بسارا ہوا جس نے بہار میں

اپنا دارالریاست قائم کیا اور اس کا نواجا تتر گدھ کا راجہ ہوا
 اس نے دریائے سون کے کنارے پاتلی کا قلعہ بنایا جو آگے
 چلکر گدھ کا مشہور پایہ تخت پاتلی پترا کے نام سے مشہور ہوا
 اجا تتر کی ماں پھولوں کے حکراں خاندان سے تھی۔ یہ خاندان
 جیسا کہ اوپر اچکا ہے ملک بہار کے ضلع مظفر پور میں گنگا کے
 کنارے ایک بڑی ریاست رکھتا تھا اور اس کا دارالحکومت
 ویسالی۔ پاتلی پترا سے ۲۷ میل کے فاصلے پر تھا جس کے کھنڈر
 اب تک صوبہ بہار میں موضع حاجی پور سے ۲۰ میل کے فاصلے
 پر گنگا کے قریب نظر آتے ہیں۔ اجا تتر کی شادی شمالی اودھ میں
 کوسالا کے راجہ کی بیٹی سے ہوئی تھی اس شادی کا نتیجہ یہ ہوا
 کہ گدھ نے کوسالا پر غلبہ پا کر اور زیادہ قوت و وسعت حاصل
 کر لی۔ ویسالی میں پھولوں کا راج شخصی نہ تھا بلکہ قوم کے شریف
 آدمی باہمی صلاح و مشورے سے حکومت کرتے تھے۔ راجہ
 اجا تتر کے بعد اسکا بیٹا درسک اور درسک کے بعد اسکے
 لڑکے اودھیانے راج پاٹ سنبھالا۔ اور گنگا کے کنارے
 کسم پور آباد کیا جو پاتلی پترا سے چند میل کے فاصلے پر تھا۔
 غرضیکہ گدھ میں جس کی ابتدا سس ناگ سے ہوئی تھی اسکی
 اولاد سے آخری راجہ بورہن مندی اور مہانندی ہوئے۔ اور
 ان کے زمانے سے اس خاندان کا نام مندی ہو گیا جس کے
 نوبادشاہ گدھ کے تخت پر بیٹھے۔ یہاں تک کہ راجہ چندر گپت
 کا زمانہ آگیا۔

راجہ چندرگپت بڑا جلیل القدر بادشاہ گزرا ہے۔ اسی کے زمانے میں جین مت اور بودہ مت کے حالات اور ان کے باہمی نزاعاً پڑھنے میں آتے ہیں۔ موتھ نے ان دونوں مذہبوں کے معتقدات اس موقع پر بیان کئے ہیں اور اس عہد کے تمدن و شائستگی کے حالات بھی جقدر لکھے ہیں وہ پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہندوستان پر اسکندر مقدونی کے حملے کی مختصر کیفیت بھی بہت خوبی سے بیان کی گئی ہے کہ کس طرح دریائے گنگا اتر کر ٹیکسلا کے شہر سے گزرتا ہوا پنجاب میں داخل ہوا اور پھر جہلم اتر کر راجہ پورس سے لڑائی میں مصروف ہوا۔ اور بیاس تک پہنچا تھا کہ وطن کو مراجعت کا حکم دیدیا۔ اس قصہ کو ختم کرنے کے بعد راجہ چندرگپت کے مفصل حالات لکھے ہیں۔

* اس راجہ سے جو سلسلہ بادشاہوں کا چلا وہ خاندان موریہ کے نام سے موسوم ہوا۔ چندرگپت کی سلطنت عروج پر تھی کہ مغربی ایشیا کے مقدونی بادشاہ سلیقوس نے جکا دار الحکومت شام میں تھا ہندوستان پر حملہ کیا مگر راجہ چندرگپت نے اس حملے کا ایسا جواب دیا کہ سلیقوس کو سخت نقصان پہنچا اور اقلیم اسکندریہ سے بلوچستان، کابل، ہرات و قندہار کے علاقے راجہ چندرگپت کے حوالہ کرنے پڑے۔ اس ناکامیابی کے بعد سلیقوس نے میگاستھینز یونانی کو اپنا سفیر بنا کر راجہ چندرگپت کے دربار میں بھیجا۔ اس سفیر نے یہاں کے حالات میں اپنی مشہور کتاب انڈیکا لکھی۔ اس کے بعد بھی ملوک سلیوقہ سے پاپی پتر میں سفارتیں آتی رہیں ۹۱ء ق م میں چندرگپت کا

دور حکومت ختم ہو گیا اس راجہ کی سلطنت دریائے نرپدا سے لیکر شمال میں تمام ہندوستان اور ہندوستان سے آگے کل افغانستان و بلوچستان تک تھی۔ مولف نے ان تمام حالات کو اپنی تالیف میں سلسلہ وار بہت خوبی سے بیان کیا ہے۔

چندرگپت کی موت پر گدھ راج کا مالک اُس کا بیٹا بندوسار ہوا۔ اسکے زمانے میں مغربی ایشیا کے بادشاہ سلیقوس نے ایک دوسری سفارت بھیجی اور اشوک پسر بندوسار کے عہد میں مصر کے بادشاہ بطلموس فیلا دلفیوس نے بھی اپنا سفیر روانہ کیا۔ اس زمانہ کے مفصل تاریخی حالات بیان کرنے کے بعد اس راجہ کے ذاتی اوصاف اور اسکے پایۂ تخت کی رونق اور بادشاہی عملوں اور مکانات کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ پائل پترا کے ذکر میں یونانی موز لکھتے ہیں کہ اسکی شان و شوکت کے سامنے سوسہ اور اصطر بھی کچھ حقیقت نہ رکھتے تھے۔ اشوک کے ذکر میں باختر و پار تھیا یعنی بلخ و بخارا و خراسان کی یونانی ریاستوں کا اور ان کے بادشاہوں اور سیتھی قوم کے خروج کا بھی ذکر آیا ہے پھر راجہ کنشک کا حال آتا ہے اور یہاں بتایا گیا ہے کہ غیر قوموں کا اثر ہند کے لوگوں پر کس حد تک پڑا۔ راجہ کنشک کے بعد گدھ راج کو پھر فروغ ہوا۔ اب گدھ کا شاہی خاندان گپت کے نام سے مشہور ہوا۔ بودہ مت اور جین مت کے نزاعات جاری رہے تا اٹھ بیسہن مت سب پر غالب آ گیا۔ اسی زمانے میں وسط ایشیا سے تاتاری قوموں کا سیلاب ہندوستان میں آیا۔

گپت خاندان کے آخری بادشاہوں کا ذکر کر کے جس میں بکرماجیت

بڑا بادشاہ ہوا شاعر کالی داس اور اسکے کلام کی خوبیوں کا ذکر کیا گیا ہے اور چینی سیاح ہوئننگ چنگ کے سفرنامہ کا بھی خلاصہ بیان ہوا ہے اور ہندوؤں کی آخری مذہبی کتابوں کا حال لکھکر اور راجگان کشمیر و نیپال و قنوج و بندہس کھنڈ وغیرہ کی آزاد ریاستوں کا ذکر کر کے راجپوتوں کے نسب سے بحث کی ہے اور پھر بنگالے کے شاہی گھرانے پال اور سین کے حالات و وج کئے ہیں۔

اخیر میں دکن خاص اور باقی جنوبی علاقہ جات ہند کی تمام ریاستوں کے حالات اور ان کے نظم و نسق کے طریقوں اور علوم و فنون کا مل لکھکر تاریخ ہند کے اس حصہ کو ختم کر دیا ہے۔

اس کتاب کو پڑھنے کے بعد مولف کی محنت و جانفشانی، حسن انتخاب و سلیقہ تحریر کی خوبیوں میں ذرا شبہ نہیں رہتا اور اس کتاب کا لطف اس وجہ سے اور بڑھ جاتا ہے کہ اُس میں ایسے ملک کے ابتدائی حالات لکھے گئے ہیں جو صدیوں سے ہمارا وطن ہے۔ لارڈ بیکن کا قول ہے کہ تاریخ کا مطالعہ انسان کی عقل بڑھاتا ہے اور جس صورت میں وہ اپنے ہی ملک اور وطن کی تاریخ ہو تو جس قدر حب وطن سے دل زیادہ متاثر ہوتا جاتا ہے اسی قدر یہ شوق بھی زیادہ ہوتا جاتا ہے کہ اپنے ملک کی اصلی کیفیت معلوم ہو اور اُسکے ابتدائی حالات سے آگاہ ہو کر اپنی موجودہ حالت پر غور کیا جاوے کہ اگر حالت اچھی ہے تو وہ کونسی چیزیں تھیں جنھوں نے اقوام عالم کی میزانِ ترقی میں اسکا پلہ بھاری رکھا اور اگر حالت خراب ہو تو ان چیزوں سے پرہیز کر کے جنھوں نے

ترقی سے روکا یا ترقی کرنے کے بعد تاریکی و تشریح کے حوالہ کیا۔
 علماء سابق و حال کو اس بات پر اتفاق ہے کہ ترقی عقل ،
 تہذیبِ نفس ، حفاظت اور اصلاح قوم کے لئے تالیف کا مطالعہ
 بڑی چیز ہے۔ ہم کو امید ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے سے
 طلباء کو ان فوائد کا سبق ملتا رہیگا۔

محمد عنایت اللہ

۳۰۔ جنوری ۱۹۲۱ء

فہرستِ مضامین

کتابِ اول تاریخِ ہند

بابِ اول

از صفحہ اول تا ۱۳

مقدمہ (۱) تاریخِ ہند میں شمالی ہند کی خصوصیت

بعض مشکلات اور اصولِ تحریر، صفحہ ۴

(۲) تاریخِ ہند کے ماخذ؛ بعض ”وقایع“

منظم تاریخی قفقہ۔ مذہبی کتب۔ صفحہ ۷۔ کتبے اور سکہ - ۸ -

غیر اقوام کا احسان ۹۔ یونانی ماخذ - ۱۱ -

اسلامی تواریخ ۱۳ -

بابِ دوم

صفحہ ۱۴ تا ۳۵

پہلی فصل: قدیم خود مختار ریاستیں -

نقشہ ہندوستان چھٹی صدی قبل مسیح میں ۱۶۔ بعض مشہور ریاستوں اور

ارد قومن کے اجمالی حالات ۱۷ -

دوسری فصل: گدھ کی سلطنت کا پہلا دور

۲۱۔ اجاستر ۲۲۔ اجاستر کے جانشین ۲۳۔
 نندہ خاندان ۲۵۔ ایرانی فتوحات ۲۷۔
 تیسری فصل: تمدن اور معاشی حالات
 ۲۸۔ مکانات کی عام طرز۔ معاشی حالات ۳۰۔
 ۳۱۔ اہل حرفہ ۳۲۔ ذات اور رنگ کا امتیاز ۳۳۔ متوسط اور
 ادنیٰ ذاتیں ۳۴۔

باب سوم

صفحہ ۳۶ تا ۵۳

پہلی فصل: مذہبی عقائد

۳۶۔ آریوں کے عقائد ۳۷۔ قربانی اور ریاضت ۳۹
 آتماں اور پراتماں ۴۱۔

دوسری فصل: جین مت

۴۲۔ ودھ مان سمایرکا مذہب ۴۶ اصول و عقائد ۴۶
 تیسری فصل: ساکی مٹنی گوتم اور بودھ مت

۴۸۔ ترک دنیا ۵۰۔ غایت اور اصول مذہب ۵۰۔
 ”بیچ کا راستہ“ ۵۱۔ خدا سے بے تعلقی؟ ۵۲۔ عملی تعلیم ۵۴

باب چہارم

صفحہ ۵۸ تا ۷۹

پہلی فصل: سکندر کی فوج کشی ہندوستان پر۔

حلقے کا سبب ۵۶، آمد کا راستہ ۵۸، جنگِ مساکا ۵۹،

دوسری فصل: جنگِ پورس (۳۲۶ ق م)

سندھ سے عبور ۶۱، ٹکھیلا ۶۱، جہلم عبور کرنے کی کوشش ۶۳

میدان اور تدابیرِ جنگ ۶۲، نقشہِ جنگِ پورس واقعہ ۳۲۶ ق م ۶۵

فتح کی یادگاریں ۶۹، بیاس تک پیش قدمی ۶۹،

تیسری فصل: سکندر کی مراجعتِ ہندوستان سے

دریائی سفر ۷۰، راستے کی لڑائیاں ۷۱، ایران کی روانگی ۷۲،

ہندوستانی صوبوں کا آزاد ہو جانا ۷۵، حملے کے بالواسطہ فوائد ۷۸

باب پنجم

صفحہ ۸۰ تا ۹۴

پہلی فصل: چندرگپت کا زمانہ

”ارتھ شاستر“ ۸۰، توسیعِ سلطنت ۸۲

دوسری فصل: مگاس تھینز کی تحریریں

راجہ کی ذات اور مشاغل ۸۵، حملاتِ شاہی ۸۶، ”شہرِ پالمی تپرا“ ۸۷،

فوجی نظم اور اسلحہ ۸۸، عام حالات ۸۹، وسائلِ آبِ پاشی ۹۱،

چندرگپت کی وفات ۹۲، راجہ بندسار ۹۳،

باب ششم

صفحہ ۹۵ تا ۱۰۹

پہلی فصل: عہدِ اشوک (۱)

نخ کلنگ ۹۵؛ کتبات ۹۷؛ مینار اور دیگر عمارات ۹۹؛
سنگ تراشی ۱۰۰؛

دوسری فصل: عمد اشوک (۲)

چیمورکھشا ۱۰۲؛ ادب اور سچائی ۱۰۳؛ احتساب ۱۰۳؛

بیرونی ممالک میں تبلیغ ۱۰۴؛ لٹکا میں کامیابی ۱۰۵

تیسری فصل: اشوک کے ذاتی حالات اور جانشین

بیویاں اور اولاد ۱۰۸؛ سوریہ خاندان کا خاتمہ ۱۰۸

باب ہفتم

صفحہ ۱۱۰ تا ۱۲۱

پہلی فصل: سنگ، (کانو) اور آندھر خاندان

پیشی متر ۱۱۰؛ برہمنوں کا فروغ ۱۱۲؛ کانو خاندان ۱۱۲؛

آندھر خاندان کا ابتدائی حال ۱۱۳؛ غیر ملکی قبائل سے لڑائیاں ۱۱۳

آندھر خاندان کا خاتمہ ۱۱۶؛

دوسری فصل: ہند کے باختری، پارٹھی اور سیتھی حکمران

باختر و پارٹھیہ کی خود مختاری ۱۱۷؛ باختر کے یونانی بادشاہ ۱۱۹

شمال مغربی ہند کی فتح ۱۱۹؛ منندر ۱۲۱؛ شاہان پارٹھیہ ۱۲۳

ہند کے پارٹھی حکمران ۱۲۳؛ سیتھی اقوام کی آمد ۱۲۵

کد فیس دوقم ۱۲۶؛ مغربی ست ماپ ۱۲۷؛ ان کا خاتمہ ۱۲۹

تیسری فصل: راجہ کنہشک

وسعت سلطنت ۱۳۱؛ بودھ مت ۱۳۳؛ بت پرستی اور اندرونی

اختلافات ۱۳۲ء کنشک کی وفات اور جانشین ۱۳۵ء

ضمیمہ باب ہفتم

صفحہ ۱۳۸

غیر اقوام کا اثر ہندوستان میں

باب مشتم

صفحہ ۱۲۲ تا ۱۶۸

پہلی فصل: سلطنت گدھ کا دوسرا دورِ فروغ

- ۱۳۳ گپت خاندان کا آغاز ۱۳۲ء سمدرگپت
 ۱۳۷ فتوحات اور وسعت سلطنت ۱۳۵ء وفات اور ذاتی اوصاف
 ۱۳۹ چندرگپت ثانی یا بکرماجیت ۱۳۸ء فاجیان کی سیاحت
 کمارگپت ۱۵۲ء

دوسری فصل: مذہب اور علوم و فنون

- بودھ مت کا ظاہری حال ۱۵۳ء برہمنی مت کا احیاء ۱۵۲ء
 سنسکرت کا احیاء ۱۵۵ء عمارت سنگ تراشی اور نقاشی ۱۵۶ء
 تیسری فصل: ہونوں کی یورش اور گپت خاندان کا خاتمہ
 سکندرگپت ۱۵۸ء ”گورے ہون“ ۱۵۹ء
 گپت خاندان کے آخری بادشاہ ۱۶۰ء ہونوں کی دوسری شکست ۱۶۲ء
 ہونوں کا خاتمہ ۱۶۴ء جس دھرم ۱۶۵ء

ضمیمہ باب ہشتم

صفحہ ۱۶۶

کالی داس اور اُس کی شاعری

باب نہم

صفحہ ۱۶۹ تا ۱۹۳

پہلی فصل: راجہ ہرش کا زمانہ

عہد ہرش کے ماخذ ۱۴۲ء تک تخت نشینی ۱۴۳ء لڑائیاں اور فتوحات ۱۴۴

آخری زمانہ اور اوصاف ۱۴۶

دوسری فصل: ہوٹین چونگ اور اس کا سفرنامہ

ولادت اور تعلیم ۱۴۸ء سیاحت ہند ۱۴۹ء واپسی اور وفات ۱۸۰

راجہ ہرش سے ملاقات ۱۸۱ء ہوٹین چونگ کی رخصت ۱۸۳

تیسری فصل: اس عہد کے عام حالات

ملکی نظم و نسق ۱۸۴ء علوم و فنون ۱۸۶ء مذہب اور اختلافات ۱۸۸

*

ضمیمہ باب نہم

ہندوؤں کی آخری مذہبی کتابیں صفحہ ۱۹۱

باب دہم

صفحہ ۱۹۴ تا ۲۲۲

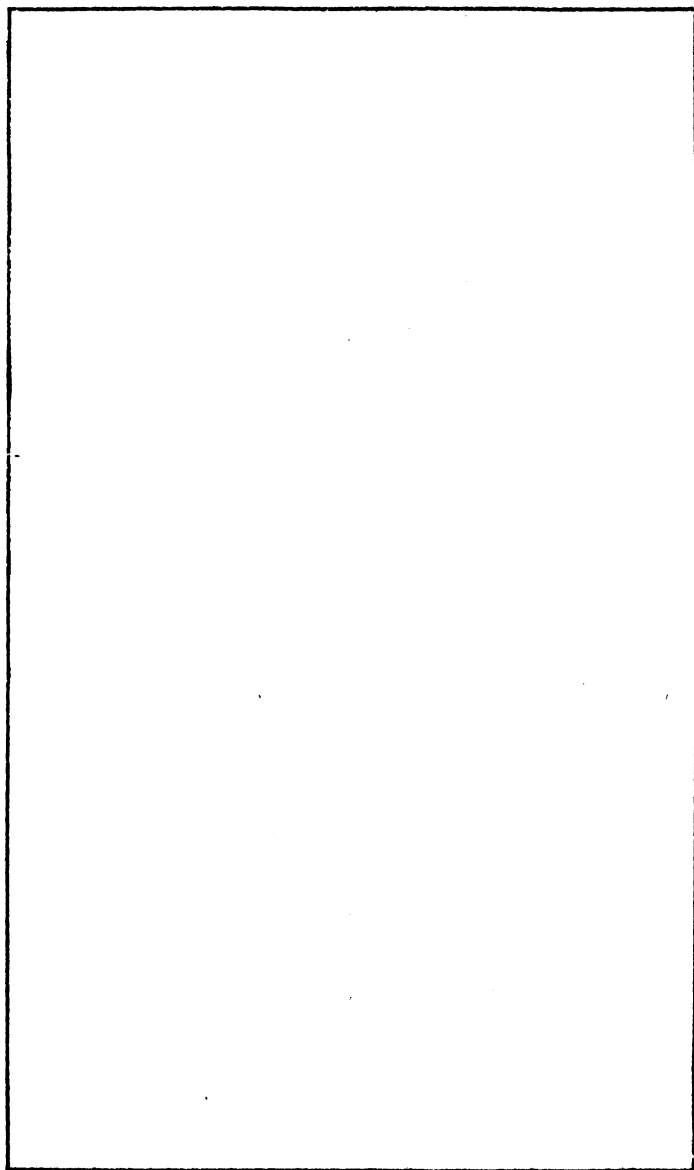
پہلی فصل: آزاد سرحدی ریاستیں

کشمیر ۱۹۶ ء شامان کشمیر کے مظالم ء نیپال ۱۹۹ ء کامروپ ۲۰۱ ء
 دوسری فصل : شمالی ہندوستان کی ریاستیں
 قنوج ۲۰۳ ء بھوبھوتی اور واک پتی ۲۰۴ ء بعد کے راجہ ۲۰۶
 گوجروں کی حکومت ۲۰۶ ء گھرواڑوں کی حکومت ۲۱۰ ء
 بندھیل کھنڈ ۲۱۱ ء
 تیسری فصل : راجپوتوں کا نسب - بنگالے کے راجہ
 سیتھی عناصر ۲۱۵ ء ہون ۲۱۶ ء چندیل اور راتھور ۲۱۷ ء
 پال خاندان ۲۱۷ ء سین خاندان ۲۲۱

باب یازدہم

صفحہ ۲۲۳ تا ۲۲۸

پہلی فصل : دکن کی ریاستیں
 خاندان چالوکیہ کا فروغ ۲۲۲ ء پل کین اول و دوم ۲۲۶ ء
 راشٹرکوٹ ۲۲۷ ء چالوکیہ خاندان کا دوسرا دور ۲۲۹
 خاندان ہوسل ۲۳۲ ء دیوگری کے راجہ ۲۳۳ ء
 دوسری فصل : جنوبی ریاستیں
 پالوا یا پلوی ۲۳۵ ء ہندو دھرم اور نرسم ہارمن ۲۳۶ ء چولا خاندان ۲۳۸ ء
 کلوننگ چولا ۲۴۲ ء پاٹڈیا اور چیرا ۲۴۳ ء
 تیسری فصل : نظم و نسق اور فنون
 ریاست چولا کے ملکی آئین ۱۴۵ ء فن عمارت اور سنگ تراشی ۲۴۷ ء
 تمت



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

کتابِ اَوَّلِ تَارِخِ ہِنْد

بَابِ اَوَّلِ

مقدمہ (۱)

جنوبی ہند کے ایک تاریخ دان نے، علم و فضل کے زور پر اپنی محبت وطن کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے۔
”ہندی تمدن کے بنیادی عناصر کو شمالی ہندوستان کی قدیم سنسکرت پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کرنا گویا ایک دشوار مسئلے کے حل میں اور الجھن پیدا کر دیتا ہے۔ کیونکہ حقیقت میں ”اصلی ہند“ ابھی تک بندھیا چل کے جنوب کی سرزمین یعنی جزیرہ نماٹے ہند کا علاقہ ہے۔ ہند کے قدیم باشندے تعداد کثیر میں یہیں آباد ہیں، جو آریوں کی آمد سے پہلے کی زبانیں بولتے ہیں اور آریوں سے پہلے کے رسم و رواج رکھتے ہیں۔

پروفیسر مندرام پٹے

اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ بھی آریوں کے رنگ میں اس قدر رنگ چکے ہیں کہ موجودہ تمدن کی بناوٹ میں دیسی تانے سے پرہیزی بانے کو جدا کرنا دشوار ہے تاہم اگر یہ امتیاز کہیں ممکن ہے تو وہ اسی جنوبی ہند میں - اور جنوب میں ہم جس قدر زیادہ بڑھیں گے اسی قدر زیادہ یہ امکان قوی ہو جائے گا۔ پس تاریخ ہند کے محقق کو اپنی تاریخی جستجو کرشنا اور کاویری کی وادیوں میں شروع کرنی چاہئے۔ نہ کہ گنگا کے میدانوں میں جس کا بہت دن سے دستور پڑ گیا ہے۔“

مگر سوال یہ ہے کہ جنوبی ہند کے قدیم تاریخی واقعات کا بھی کوئی سرخ ہے جس کی بنا پر ہم دراوڑی زبان اور تمدن کی قدامت کا صحیح اندازہ کر سکیں؟ قدیم تاریخ کے جو بڑے پھلے ماخذ آج تک میسر آئے ہیں، قریب قریب وہ سب شمالی ہند کے حالات سناتے ہیں اور جنوبی ہند کے واقعات کا پتہ چلتا بھی ہے تو ضمناً۔ اور یہ ظاہر ہے کہ صحیح تاریخ صرف ان واقعات کا نام ہو سکتا ہے جن کے متعلق معتبر تحریر اور ٹھیک ٹھیک سن موجود ہوں۔ مذہبی قصص، عام روایات یا نظم و نثر سے اس عہد کے تمدن کی ایک دھندھلی تصویر نظر میں پھرنے لگتی ہے مگر کچھ ضرور نہیں کہ یہ تصویر ہر شخص کی متخیلہ میں یکساں ہو۔ پس یہ مجموعہ اہل تاریخ کے نزدیک کتنا ہی دلچسپ

اور قابل قدر کیوں نہ ہو، تاریخ نہیں کہلا سکتا بلکہ اس کی بنیاد پر بہتر سے بہتر قیاس بھی اُس وقت قابل لحاظ مانا جاتا ہے جب کہ تصدیق کے لئے کوئی اور مستند شہادت موجود ہو۔ دوسرے اگر یہ مان لیا جائے کہ شمال میں پہاڑ اور جنوب کی طرف سمندر پھیلا کر قدرت نے بڑے اعظم ہندوستان کو دیگر ممالک سے علیحدہ ایک ملک بنا دیا ہے اور اختلافاتِ عظیم کے باوجود یہاں کے تمام باشندوں میں کچھ نہ کچھ یک رنگی پائی جاتی ہے، تو بھی موئخ کی شکل رفع نہیں ہوتی کیونکہ کسی ملک کی تاریخ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہاں کے افراد یا گروہوں کے پریشان حالات جمع کر دئے جائیں یا ربط و ترتیب کے بغیر ان کے رسم و رواج کے بیان پر اکتفا کی جائے، بے شبہ یہ چیزیں تاریخ کے لوازمات ہیں اور آج کل ان کے سمجھنے اور سمجھانے پر بہت زور دیا جاتا ہے بایں ہمہ موئخ کا پہلا فریضہ یہی ہے کہ وہ جہاں کی تاریخ لکھنے بیٹھا ہے وہاں کی حکومت یا اربابِ حکومت کے کارنامے ترتیب زمانی کے ساتھ تحریر کر دے اور اسی ضمن میں لوگوں کی معاشرت اور دماغی حالت پر بھی اس طرح بحث کرتا جائے کہ پڑھنے والے کو ان واقعات میں اور جمہور کے اندرونی حالات و افکار میں باہم علت و معلول یا لازم و ملزوم کا تعلق نظر آنے لگے، لیکن اس اصول کی رُو سے بھی

”تاریخ ہند“ میں جنوبی ہند کو کوئی نمایاں جگہ نہیں مل سکتی۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ایک اعتبار سے قدیم ہندوستان کی ایک تاریخ لکھنا ہی بے اصولی کی بات ہے کیونکہ انگریزوں کی آمد سے پہلے اس تمام ملک پر کوئی واحد حکومت نہ تھی اور کبھی کبھی کسی اقبال مند راجہ یا مسلمان بادشاہوں کے حصہ اعظم پر سکہ رواں ہوا بھی تو چند روز کے بعد پھر مختلف صوبے خود مختار ہو گئے اور ان میں الگ الگ حکومتیں بن گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ دور وسطیٰ کی فارسی تاریخیں تمام ہندوستان کی تاریخیں نہیں ہیں بلکہ الگ الگ ریاستوں یا حکمران خاندانوں کے حالات میں لکھی گئی ہیں۔ چونکہ انگریزی مصنفین کی نظر میں اس مجموعہ تواریخ کو ایک کتاب میں جمع کرنا جس قدر دشوار تھا اسی قدر ضروری یا دلچسپ نہ تھا، لہذا انہوں نے ہندوستان کی عام تاریخ میں ان کا بہت کم اور ضمناً ذکر کیا ہے اور اپنی کتابوں میں صرف ان حکومتوں کے حالات لکھے ہیں جو ہندوستان کے حصہ اعظم پر مستط تھیں۔ اور اس قسم کی وسیع سلطنتوں کے مرکز بلا استثناء شمالی ہندوستان میں رہے پس ”تاریخ ہند“ درحقیقت شمالی ہند کی تاریخ بن گئی جس کی ہمارے فاضل درسی پروفیسر کو شکایت ہے۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ مسلمانوں کے عہد سے پہلے اول تو ہند کے تاریخی حالات ہی کم ملتے ہیں

دوسرے جو کچھ ملتے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس دور میں ایسی بڑی سلطنت جسے ہم مذکورہ بالا معیار کے مطابق ہندوستان کی حکومت کہہ سکیں، شاید ہی کبھی قائم ہوئی ہو ورنہ قدیم ہندوستان کا زیادہ زمانہ بلوک طوائف کا زمانہ ہے جس میں دیس دیس کا راجہ دعوائے خود سری رکھتا تھا اور کہیں کہیں جمہوری طرز کی حکومت تھی۔ اس انتشاء و علیحدگی کے قدرتی اسباب تھے یعنی اُس عہد میں نہ تو آبادی کی اس قدر کثرت تھی نہ رسل و رسائل اور آمد و رفت کے ذریعے ایسے تھے کہ ایک مرکزی مقام سے دور دماز کے علاقوں پر فرس روٹی کی جا سکے ورنہ اس بات کی شہادتیں ملتی ہیں کہ قدیم اہل ہند کے تصور میں سارے ہندوستان کا "ایک بھتر کے نیچے" آنا ممکن یا کم سے کم قابلِ آرزو ضرور ہو گیا تھا۔

اوپر کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر ہم یق و عن انگریز مصنفوں کے نکتے کے مطابق اپنی کتاب مرتب کرنی چاہیں تو قدیم تاریخ کا دائرہ تنگ ہو جائے گا اور اس میں صرف چار پانچ بڑے بڑے ہمارا جوں کے حالات ہوں گے جو اپنے اپنے زمانے میں ہندوستان کے حصہ العظم کو زیر نگین لا سکے تھے۔ اور چونکہ ان کے عہد حکومت ایک دوسرے سے بالکل جدا اور بعید ہیں اس لئے یہ حالات باہم غیر مربوط اور بہ اعتبار سنین بالکل غیر مسلسل ہوں گے۔

حال میں بعض تاریخ نویسوں نے اس خرابی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے اور سچ یہ ہے کہ ”تاریخ“ میں جب تک واقعات کی ترتیب زمانی موجود نہ ہو وہ محض بے جوڑ داستانوں کا مجموعہ رہ جاتی ہے اور اصلی مقصد یعنی کسی قوم کی تدریجی ترقی یا تنزُّل کے اسباب کا سراغ لگانا، قوت ہو جاتا ہے۔ پس ہم بھی چاہتے ہیں کہ حتی الامکان ہند کے قدیم حالات کو قیدِ سنین اور ترتیبِ زمانی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے خواہ اس میں بجائے ایک حکومت کے ہمیں ایسی متعدد ریاستوں کے مختصر حالات لکھنے پڑیں جن کا ایک دوسرے سے کوئی سیاسی تعلق نہ تھا، البتہ مسلمانوں کے زمانے میں یہ شرط نبھ سکتی ہے کہ صرف اُن بڑی سلطنتوں کے حالات سے بحث کی جائے جو ہندوستان کے حصّہ اعظم پر پھیلی ہوئی تھیں اور ”سلطنتِ ہند“ کے نام سے موسوم کی جا سکتی ہیں۔

(۲)

لیکن قدیم تاریخ لکھنے میں بڑی اُلجھن اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ ہندوؤں نے اپنی کوئی تاریخ نہیں چھوڑی اور مسلمانوں کے آنے سے پہلے اس موضوع پر ایسی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی جس سے ہندوستان کے تاریخی واقعات کا پتہ چل سکے، ”راجگان کشمیر“ کے حالات میں بے شبہ ایک سنسکرت کتاب (راج ترنجنی) موجود ہے اور اس میں

ہندوستان کی قدیم روایات بھی جمع کی گئی ہیں لیکن اول تو وہ بارھویں صدی عیسوی کی تالیف ہے دوسرے کشمیر کے ہمعصر واقعات کے سوا اس میں ہندوستان خاص کے متعلق اکثر بے سوچا باتیں درج کر دی ہیں جن پر پوری طرح اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ یہی حال نیپال و آسام کے بعض ”واقعات“ کا ہے اور سنسکرت، تامل یا پراکرت میں واقعات حاضرہ پر اگر کوئی تحریر ملتی ہے تو وہ ایسی شاعرانہ مثنویاں ہیں جنہیں تاریخ نہیں کہہ سکتے، بایں ہمہ اہل تحقیق کے لئے یہ بھی بہت کام کی چیزیں ہیں اور ان میں سب سے زیادہ قابل قدر نظم ”رام چرت“ ہے جو حال میں دستیاب ہوئی اور بنگالے کے پال خاندان کے راجاؤں کی مہج میں لکھی گئی تھی؛

راجہ ہرش اور بیر بکرماجیت کی مہج میں بھی دو مثنویاں ملی ہیں جن میں سے ایک ”ہرش چرت“ ساتویں صدی عیسوی کے شروع میں لکھی گئی تھی اور دوسری غالباً بارھویں صدی کے اوائل میں تصنیف ہوئی؛ سنسکرت کی شہرہ آفاق رزمیہ مثنویاں، یعنی مہابھارت اور رامائن زماؤں ماقبل تاریخ کی رسم و رواج اور ہندو تمدن کا نہایت دلکش مرقع دکھاتی ہیں لیکن ان کی تصنیف کے وقت یا تاریخی زمانے میں ہندوستان کی جو حالت تھی، اُس پر ان سے کوئی خاص روشنی نہیں

پڑتی اور اس لئے مورخ کے لئے وہ اتنی بھی کار آمد نہیں جتنی ہندوؤں یا بودھ اور جینیوں کی بعض مذہبی کتابیں جن میں شاہی خاندانوں کے نام اور کہیں کہیں تاریخی واقعات محفوظ رہ گئے ہیں۔ اس ناکافی تحریری شہادت کے علاوہ جو ہندوستان پیش کرتا ہے، قدیم تاریخ کا ایک ایسی ماخذ وہ کتبے اور سکے ہیں جن میں بعض بادشاہوں کے نام، سینہ حکومت یا اور کوئی کام کی بات مل جاتی ہے۔ اس قسم کے کتبے

تاریخ کے ماخذ
(۲)

۱۔ قدیم کتبائے متعلق سنسکرت اسمتہ نے اپنی تازہ ترین کتاب "اکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا" مطبوعہ ۱۹۱۹ء میں جو کچھ لکھا ہے اس کا بلفظ ترجمہ کر دینا فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔
۲۔ تاریخ کے ماخذوں کی فہرست میں سب سے پہلی جگہ کتبائے کو دی گئی ہے اور مجموعی طور پر دیکھئے تو معلومات کا اُن سے بہتر و معتبر ذریعہ اور کوئی نہیں مگر افسوس ہے کہ اب تک ایسا کوئی کتبہ دستیاب نہیں ہوا جسے یقین کے ساتھ تیسری صدی ق م سے پہلے کا سمجھا جاسکے حالانکہ مانورہ صدی سے بہت پہلے کے کتبائے ملنے کچھ غیر ممکن نہیں ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ہمارے پاس موجود ہیں انہی میں بعض عمد اشوک سے پہلے کے ہیں۔ قدیم ہندوستان کے کتبائے جو بالعموم پتھر یا دھات پر کندہ ہوتے ہیں، بادشاہوں یا حکام کی سرکاری تحریریں اور یا مختلف وجوہ سے لوگوں نے خانگی طور پر انہیں کندہ کرا دیا ہے۔ سبکی کتبے زیادہ تر کسی عمارت کی تعمیر یا کسی بت کے نصب کئے جانے کی اور یا کسی خاص واقعے کی یادگار میں کندہ کئے گئے ہیں۔ اور اس دوسری قسم کی یادگاروں میں کسی ستاب کے مختصر نام سے لے کر سنسکرت کے طویل قصائد تک، مختلف تحریریں کندہ کی ہوئی ملی ہیں۔ یہ قصیدے جن میں فتح مند بادشاہوں کی فتوحات کا بیان کیا گیا ہے "پرسستی"، کہلاتے ہیں۔
دھات کے کتبوں میں زیادہ تر وہ شہابی اسلحہ ہیں جو عطائے جاگیر کی تصدیق میں تانبے پر کھدوادی گئی تھیں۔ ان میں سے بعض (خاص کر دکن میں) بہت طویل ہیں اور ان سے بالعموم بادشاہ وقت اور اس کے اجداد کا کچھ طل معلوم ہو جاتا ہے۔ ہندوؤں کی قدیم تاریخ میں سینہ کا تین، جس حد تک ہو سکا ہے، وہ انہی کتبائے کی بنا پر کیا گیا ہے۔ * * * * * (مقدمہ کتاب صفحہ ۱۶)

جنوبی ہند میں بہ کثرت پائے جاتے ہیں لیکن وہ اتنے پڑانے اور قابلِ قدر نہیں جتنے شمالی ہند کے کتبات ہیں جن میں سب سے مشہور مہاراجہ اشوک کے وہ فرامین یا پند و نصائح ہیں جنہیں اس نے تیسری صدی قبل مسیحی میں چٹانوں اور سنگین مناروں پر کھدوا دیا تھا۔ ان کتبوں سے اس نامور مہاراجہ کی وسعتِ سلطنت اور اصولِ جہانبانی کے متعلق بعض نہایت مفید باتیں معلوم ہوتی ہیں اور اُس کے عہد کی تاریخ کا سب سے بڑا ماخذ وہی ہیں؛

ہند کے قدیم آریوں نے آئندہ نسلوں کے لئے جو تاریخ کے ماخذ (۳) کچھ اپنی تاریخی یادگار چھوڑی اس کی کل کائنات یہ تھی جس کا بالاجمال اوپر بیان ہوا، اور کچھ ہندوستان پر منحصر نہیں بلکہ اس نسل کے دوسرے وطن (ایران) کا بھی یہی حال ہے کہ خود اہل ایران کی لکھی ہوئی کوئی قدیم تاریخ میسر نہیں آتی حالانکہ چھٹی صدی ق م میں ان کی شاہانہ تہذیب اور وسیع سلطنت دنیا میں اپنا نظیر نہ رکھتی تھی اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ گو علم و فن کی بعض شاخوں میں قدیم آریوں نے ترقیاں کیں لیکن فی تاریخ سے انہیں طبعاً کوئی لگاؤ نہ تھا اور اس ضروری شعبے سے غفلت برتنے کی یہ دولت دیگر اقوام کے مقابلے میں اُن کی دماغی ترقی مشتبہ ہو گئی ہے؛ باقی ہندوستان کے قدیم یا دراوڑی باشندوں کا تو ذکر ہی کیا ہے جنہیں آریوں نے مغلوب

کر کے اپنا غلام بنا لیا تھا۔
 اہل ہند کی اس بے پروائی کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم
 ان کی تاریخ کے لئے سب سے زیادہ اُن بدیسوں کے
 دست نگر ہوئے جو کسی پیرائے میں بھی اس ملک کے
 حالات لکھ گئے ہیں۔ ان میں سب سے پرانا لکھنے والا
 ہرودوتس یونانی ہے جس نے اپنی تاریخ ”مخارجات ایران“
 میں دولتِ ایران اور شمالی ہند کے سیاسی تعلقات کا ذکر کیا
 ہے۔ یہ امر کہ ہندوستان کے بعض علاقے ہرودوتس کے
 وقت سے بھی پہلے سلطنتِ ایران میں داخل تھے،
 ”نقشِ رستم“ کے اس مشہور کتبے سے ثابت ہے جسے
 داریوشِ اول (یا اسفندار) نے پائے تختِ اصطخر کے قریب
 کندہ کرایا تھا۔ (۱۸۶۶ ق م)

لیکن یہ بہت جملِ حوالے ہیں اور سچ یہ ہے کہ
 جہاں تک ہمیں علم ہے، سکندر اعظم کے حملے سے پہلے
 بیرونی دنیا کو ہند کی اصلی حالت سے واقفیت کا بہت ہی
 کم موقع ملا تھا۔ البتہ اس کی وفات کے بعد جب مصر و
 شام کے بادشاہوں نے ہندوستانی درباروں میں اپنے سفیر
 بھیجے تو انہوں نے یہاں کے متعلق بہت کچھ حالات جمع
 کئے جن کے بعض حصے قدیم یونانی و رومی مصنفین کی
 کتابوں میں محفوظ رہ گئے ہیں۔ ان سفیروں میں سب سے
 زیادہ **مگاس تھنیز** کا نام مشہور ہے۔ جس کی کتاب

یونانی نام

”انبرکا“ کے بعض اجزا زمانے کی دست برد سے بچ گئے اور ہماری تاریخ کا سب سے قدیم ماخذ ہیں، خود سکندر کے ساتھ جو لوگ ہندوستان کے حملے میں شریک تھے گو اُن کی تحریریں اب ناپید ہیں، لیکن دوسری تیسری صدی عیسوی تک محفوظ تھیں اور انہی کو سامنے رکھ کر ایک رومی عہدہ دار ایبریان نے سکندر کے حملے اور ہندوستان کے حالات پر اپنی لاجواب تاریخ مرتب کی تھی جس میں چوتھی صدی قبل مسیح علیہ السلام تک کا ذکر ہے۔

یونانیوں کے بعد ہم سب سے زیادہ چینیوں کے رہنما ^{ہننت} ہیں جن میں سو ماکیان کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو یونان میں ہرودوتس کو ملا۔ اس مؤرخ نے اپنی کتاب ستراقم کے قریب مکمل کی تھی اور اس میں کہیں کہیں ہندوستان کا بھی ذکر آگیا ہے اور فرانسیسی مترجمین و محققین کی محنت کے طفیل ہمیں ان مجمل حوالوں سے قدیم تاریخ ہند کے سینے کی صحت میں بہت مدد ملتی ہے، لیکن سب سے پہلا پردیسی جس کا سفر نامہ ہند بجز سلامت رہ گیا فابیان چینی ہے جو چوتھی صدی عیسوی کے آخر سال روانہ ہو اور شنگہ سے الگہ تک ہندوستان میں رہا کہ بودھ مت کی تعلیم کو خاص اس کے مولد میں حاصل کرے، یاد رکھنا چاہئے کہ فابیان ہند کا پہلا چینی سیاح نہیں ہے بلکہ اُس سے بھی پہلے چین کے لوگ جن میں

چینی ماخذ

بودھ مت پھیل گیا تھا اپنے مقدس مقامات کی زیارت کرنے
یہاں آیا کرتے تھے۔ اور انہی کی زبانی روایتیں سن کر
مورخ سوماگیان نے اپنی معلومات اخذ کی ہونگی۔ لیکن
ان قدیم زائرین میں کوئی ایسا علم دوست نہ ہوا جو اپنی
سیاحت کے حالات لکھ لیتا، اور اگر کسی نے لکھے ہوں
تو وہ بالکل بے نشان اور محو ہو گئے جن کا کسی پرانی
چینی کتاب میں حوالہ نہیں ملتا، غرض فاہیان چینی کا
نام زندہ رہا تو اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اس نے
اپنے زمانہ سیاحت کے حالات قلم بند کئے اور ”فوکٹوکی“
(یعنی بودھ سلطنتوں کے حالات) نامی کتاب اپنی یادگار
چھوڑی۔ اس کتاب سے ہندوستان کی تاریخ قدیم میں بڑی
مدد ملتی ہے اور انگریزی میں اس کے کئی کئی ترجمے
شائع ہوئے ہیں لیکن اس بارے میں فاہیان سے
بھی کہیں زیادہ ناموری اس کے ایک اور ہم وطن
کو حاصل ہوئی جو دو صدی بعد ممالک ہند کی سیاحت
کو آیا اور ۶۲۹ء سے ۶۴۵ء تک ہندوستان کے قریب
قریب ہر گوشے میں پھر کر اس نے اپنا لا جواب
سفرنامہ تحریر کیا جو ”مغربی دنیا کے حالات“ کے نام
سے یورپ کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے۔ اس
فاضل سیاح کے نام کے متعلق حال میں سخت اختلاف
تھا اور ابھی تک یہ طے نہیں ہوا کہ اسے ”ہیون چوانگ“

کہیں یا ”ہوان کوان“ یا ”ہیوئین چونگ“ یا ہیون تسان (تسانگ یا تانگ) جس سے وہ اول اول معروف تھا۔ بہر حال ایک محقق کے فیصلے کے مطابق یہ آخری دونوں تلفظ جازز ہیں اور ہم اپنی کتاب میں اُسے ”ہیوئین چونگ“ ہی لکھیں گے پُر

ہندوستان کے متعلق سب سے آخری جس نامور مصنف اسلامی تواریخ نے کتاب (تحقیق الہند) لکھ کر تحقیق کا حق ادا کیا وہ علامہ البیرونی ہے؛ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کے بعض حصوں سے مسلمانوں کو آٹھویں صدی عیسوی ہی میں خاصی واقفیت ہو گئی تھی اور اس زمانے کی اسلامی تاریخیں قدیم ہندوستان کے متعلق بعض کار آمد باتیں بتاتی ہیں لیکن بیرونی نے جس محنت اور ساہا سال کی تحقیقات کے بعد ہندوؤں کی علمی زبان اور علوم حاصل کئے اس کی نظیریں خود اس زمانے میں کم ہوں گی پس اتنی وسیع واقفیت کے بعد جو کتاب اس نے تیار کی (۱۰۳۱ء) وہ آج بھی ہندوستان کے قدیم تمدن اور علوم کی بحث میں مستند مانی جاتی ہے پُر

باب دوم

پہلی فصل :- قدیم - خود مختار ریاستیں

ساتویں صدی ق م سے پہلے ہندوستان کی تاریخ ہم ظلمت کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ تاریخی زمانے کی وہ قوم جسے ہم آریا کہتے ہیں، کچھ خبر نہیں کہ ہندوستان میں کہاں سے آئی اور کب آئی؟ یہ قیاس کہ وہ شمال مغرب کی طرف سے آئی تھی اس لئے قابل تسلیم نظر آتا ہے کہ ہندوستان کے شمال مغربی حصوں میں جو لوگ آباد ہیں، ان کا رنگ روپ اور خط و خال آریائی ہیں۔ آریائی زبانوں کا دور دور تک پھیلا ہوا ہونا شہادت دیتا ہے کہ اس نسل کے افراد نہ صرف ایران و ہندوستان میں آباد ہو گئے تھے بلکہ مغرب میں ممالک یورپ تک ان کے قدم پہنچے، مگر یہ بھی اس امر کا ثبوت نہیں ہے کہ جن ملکوں میں آریائی زبان پہنچی وہاں خالص آریا نسل کے لوگ آباد تھے کیونکہ خود زبان کی خوبی یا حکومت و تمدن کی برتری دوسری قوم کے لوگوں میں کسی زبان کو رواج دے سکتی ہے اور یہ لازمی نہیں کہ وہاں کے

باشندے نسلاً بھی اسی قوم کی اولاد میں ہوں جس کے قدیم الفاظ آج اُن کی زبان میں داخل ہیں۔ اس کے علاوہ ہزاروں برس تک دوسری قوموں سے میل جول اور آبادی کے بڑے بڑے انقلابات سے جو نتائج پیدا ہوئے ہوں ان کا ٹھیک اندازہ کرنا دشوار ہے اور قیاسات کا نام تاریخ نہیں ہو سکتا۔ خلاصہ یہ کہ ہندوستان کے قدیم باشندوں کی تاریخ درکنار، ہمیں خود آریوں کی آمد کے بعد سینکڑوں برس کے حالات کا صحیح علم نہیں اور چوتھی یا پانچویں صدی ق م کے جو کتبے یا مذہبی تحریریں میسر آتی ہیں ان سے صرف سو سو سو برس پہلے تک کے حالات کا کچھ سراغ چلتا ہے۔ بالفاظ دیگر، ہند (اور وہ بھی شمالی ہند) کی قدیم تاریخ چھٹی صدی ق م سے شروع ہوتی ہے، اگرچہ وہ بھی نہ مفصل ہے نہ مسلسل۔ بہت سے مقامات کی سرگذشت کا کچھ پتہ نہیں اور جہاں کے حالات ملتے ہیں ان میں بھی قیاس اور غیر معتبر روایات کا دخل ہے اور پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ برس یا زیادہ کا بیچ میں وقفہ پڑ جاتا ہے کہ اس دوران میں جو واقعات پیش آئے

ملا اہل تحقیق کے نزدیک اب یہ بات قریب قریب مسلم ہے کہ ہندوستان میں تحریر کا فن آشور و ہاتل سے آیا جہاں سامی قوموں کی پر شوکت سلطنتیں قائم تھیں۔ آٹھویں صدی کے خاتمے یا ساتویں صدی ق م کے آغاز میں جنوبی ہند کے تاجر وہاں کی رسم کتابت اپنے وطن میں لائے تھے لیکن اس فن کی ترویج و ترقی شمالی ہند میں ہوئی نہ

(۱) نقشے میں سب سے اوپر ریاست گندھارا کا نام نظر آتا ہے اور قرائن چاہتے ہیں کہ یہی لفظ بعد میں قندھار ہو گیا۔ لیکن جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اُس وقت گندھارا میں زیادہ تر ہندوستان کا وہ ٹکڑا شامل تھا جسے آج کل ”شمال مغربی سرحدی صوبہ“ کہتے ہیں، غالباً اس ریاست کے ہندوستان میں داخل رہنے کی وجہ یہی ہے کہ اس کا پائے تخت یا صدر مقام بھی کوہستان سلیمان کے اس طرف یعنی موجودہ راولپنڈی کے قریب واقع اور اپنے بانی قبیلہ گنگا کے نام سے لگائے (یا گنگلا) موسوم تھا۔

(۲) کورو کی سلطنت، جس کا پائے تخت اندر پریشٹ موجودہ شہر دہلی کے قریب واقع تھا، روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ بودھ مت کے عروج سے چند صدی پہلے یہ سلطنت بڑے عروج پر تھی اور پنجاب میں کسی علیحدہ ریاست کا ذکر نہ آنے سے بھی قیاس ہوتا ہے کہ یہ شمالی علاقہ کورو کے زیر نگیں ہو گا۔

(۳) کورو کے مشرق میں دریائے گنگا سے کوہستان ہمالیہ تک پنجال یا پنچال قوم کی حکومت تھی اور جنوب کی طرف یہ لوگ موجودہ اودھ کے علاقہ تک دوآب میں بھی پھیلے ہوئے تھے۔

(۴) پنجالوں کے اس جنوبی علاقے اور مکس یا مٹیس قوم کے ملک میں جتنا صفا فاصل بناتی تھی اور اندر پریشٹ کے مغربی اضلاع تک انہی مکسوں کا دور دورہ تھا۔

(۵) اگرچہ ٹھیک ٹھیک سرحدیں بتانا محال ہے، لیکن اتنا پتہ چلتا ہے کہ جتنا کے مغرب میں مکسوں کے علاوہ ایک اور قوم **سورسین** آباد تھی جن کا صدر مقام **مذھورا** اسی دریا کے کنارے واقع تھا اور عجب نہیں کہ یہی لفظ بگڑ کر **متھرا** ہو گیا ہو؟

(۶) **اونتی**، جس کا پائے تخت قدیم زمانے میں بھی **اُجین** (یا **اُجینی**) تھا، موجودہ مالوے کے علاقے کو کہتے تھے۔ **آریا نسل** کے لوگوں کا مغرب اور جنوب میں **گوداوری** تک بعض مقامات پر جا بسنا بھی ثابت ہوتا ہے لیکن یہ نو آبادیاں غالباً بہت بعد کے زمانے میں بسیں اور نو وارد **آریا اول** **اول ہندوستان** میں صرف مالوے تک پھیلے تھے؟

(۷) **وچین** قوم کے لوگ موجودہ صوبہ **جات** متحدہ کے شمالی علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے اور ان کے دد سب سے قوی اور مشہور جتھے **پچھوی** یا **کھوی** اور **والسائی** کہلاتے تھے۔ ان کا سب سے بڑا مرکز **ویسالی** نامی شہر تھا

علی پچھویوں کے متعلق **ونسٹ اسمتھ** کا خیال ہے کہ وہ نسلِ اہل تبت کے **درنگولی** خاندان سے ہیں۔ ان کا اپنے مردوں کو میدان میں ڈال دینا یا دنتوں پر باندھ دینا، اور اسی طرح بعض جرائم کی سزائیں اہل تبت کے رسم و رواج سے مشابہ ہیں اور دیگر قزاقوں سے بھی مذکورہ بالا قیاس کی تصدیق ہوتی ہے، حتیٰ کہ **ونسٹ اسمتھ** کے نزدیک **درنگان** غالب یہ ہے کہ پچھوی قوم کے قبیلہ **تاسکی** (ساکیا) کا مشہور منی گوتم بودھ **درنگولی** (دماغلیہ) نسل کا آدمی تھا، (آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا ۱۹۱۹ء ص ۴۷)۔

جس کا بعض اہل تحقیق نے موجودہ ضلع مظفر پور (بہار) میں اس مقام پر کھوج نکالا ہے جہاں آج کل قصبہ بساڑ آباد ہے۔ یہ نہایت وسیع و بارونق شہر تھا اور اس کے گرد تین تین فصیلیں بنی ہوئی تھیں۔ وہیں قوم کے بڑے بڑے رئیس و راجہ اسی مقام پر رہتے تھے اور ان کا دوسرا مستقر متھلا ویسالی کے کچھ اوپر شمال مغرب میں آباد تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ یہاں وڈیہائی گروہ کے لوگوں نے ایک مستقل ریاست الگ بنائی تھی جسے وڈیہا کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ لفظ بعد کی بھاشا میں وودھ رہ جائے گا اور اس میں اور اودھ میں جو مناسبت ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ بعض شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ گوتم بودھ کے وقت میں یہاں بہت وسیع اور جمہوری طرز کی سلطنت تھی۔ پس کیا عجب کہ انقلابات زمانہ سے اس سلطنت کا نام اس کے صرف ایک صوبے (اودھ) میں یادگار رہ گیا ہو کیونکہ قدیم تاریخ میں اس قسم کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ اس سے بھی زیادہ قوی قیاس یہ ہو سکتا ہے کہ اس لفظ میں الف ”غیرت“ کا ہے۔ (اودھ یعنی وہ علاقہ جو وودھ کے باہر یا غیر وودھ ہو) لیکن جدید مغربی محققین میں سے کسی کا خیال اودھ نہیں گیا اور بعض مصنف اودھ کو اجدھیا کی بگڑی ہوئی صورت بتاتے ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ جو علاقہ اب اودھ کہلاتا ہے وہاں ان دنوں ایک علیحدہ

سلطنت قائم تھی جس کی سلطنت گدھ کے ساتھ کشمکش کا حال ہم آگے پڑھیں گے تو

(۸) یہ کوسل کی سلطنت تھی جس کا پائے تخت

ساوتی یا سراتی، غالباً موجودہ شہر گورکھپور سے سوئی

سٹریٹس اوپر (گویا نیپالی علاقے میں) واقع تھا، چھٹی صدی

ق م میں یہ ہندوستان کے چھ بڑے شہروں میں گنا

جانا تھا اور گنوتم بودھ کے بہت سے واقعات زندگی کا

اس شہر سے تعلق بیان کیا گیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ

ابھی تک اس کی جائے وقوع یقین کے ساتھ معلوم نہیں

ہوئی حالانکہ امید ہوتی ہے کہ وہاں بودھ مت والوں کی کچھ نہ کچھ

پلنی یادگاریں اور کتبے ضرور زمین کے نیچے مدفون پڑے ہوں گے۔

(۹) لیکن زبائے تاریخی کی سب سے بڑی اور قوی سلطنت

دریائے گنگا کے نیچے اس علاقے میں قائم تھی جو آج کل بہار

کے صوبے میں داخل ہے۔ غالباً اول اول اس کی مغربی حد

سوں ندی تھی اور جنوب میں بندھیا پل کے پہاڑوں کا وہ سلسلہ

جو چھوٹے ناگپور میں پھیلا ہوا ہے۔ لیکن بعد میں اس نے بڑی

قوت و وسعت حاصل کی اور ہماری تاریخ کے اس باب میں

زیادہ تر اسی سلطنت کا ذکر آئے گا۔

فہم ذکرہ بالا نوریاستوں کے علاوہ بودھوں کی روایات اور پرتوں میں اور سات

ریاستوں یا خود مختار قوموں کا نام بھی آیا ہے اور یہ قدیم فہرست کل سلاطین ناموں پر مشتمل

ہے۔ لیکن جن قوموں کا دائرہ حکومت بہت تنگ تھا یا جو دوسری ریاستوں کی ماتحت

بن گئیں، انہیں ہم نے نظر انداز کر دیا ہے۔

دوسری فصل: گدھ کی سلطنت کا پہلا دور

اول اول یہ بہت چھوٹی ریاست تھی اور تاریخی زمانے میں یہاں سب سے پہلے سیس ناگ راجہ کا خاندان فرماں روا ٹی کرتا تھا۔ لیکن ساتویں اور چھٹی صدی ق م میں جو ہندوستان کے عقلی تلامظ اور دماغی تنگ و دو کا گویا پہلا تاریخی دور ہے، ذہنی ترقی کا تمدن و سیاسیات پر اثر پڑنا لازمی بات تھی۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ اہل ہند کے افکار میں اسی ہیجان کی تحریری شہادتیں باقی ہیں جن کے طفیل ہم اُس عہد کے سیاسی حالات کا کچھ سراخ چلا سکے ورنہ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، خاص اس موضوع (تاریخ) پر ہندوستان میں کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔

بہر حال، بانی خاندان کے نام کے بعد گدھ کا سب سے پہلا راجہ جس کے حالات ہم تک پہنچے، ہم بسا رہے جو اپنے مورث اعلیٰ سیس ناگ کی پانچویں پشت میں تھا۔ اپنے پائے تخت کو مستحکم کرنے کے بعد اسی نے ملک ستانی پر کمر باندھی اور ایچا کی ریاست کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا (یہ چھوٹی سی ریاست گدھ کے ہمسائے میں قریب قریب اسی علاقے میں تھی جسے اب ضلع بھالگلپور کہتے ہیں) پھر ہم بسا رہے کوسل کی راج کمار سے شادی کی اور دوسرا بیواہ پھویوں کے طاقتور قبیلے میں کیا جس سے اس کی قوت میں اضافہ ہوا۔

اور پودھوں کی روایت کے بہ موجب اسے خود اس کے بیٹے
 اجاستر نے مار کر بادشاہی لی، تو گدھ پہلے کی نسبت کہیں
 زیادہ طاقتور سلطنت بن گئی تھی۔ بم بسار کے متعلق اتنا معلوم
 ہے کہ اس نے اٹھائیس برس راج کیا لیکن اس کی تخت نشینی
 (۳۵۶ ق م) اور موت (۳۵۶ ق م) کے سن قیاسی ہیں
 اور بیٹے کے ہاتھ سے مارا جانا بھی کسی قدر مشتبہ یا کم سے کم
 مبالغہ آمیز روایات پر مبنی ہے کیونکہ اول تو اجاستہ کی ماں،

وزدھ مان جہاگیر Varadhmana mahavira کی
 رشتہ دار تھی اور یہ شخص جین مت کا بانی اور اس لئے
 گنوتم بودھ کا حریف و ہم عصر گزرا ہے۔ دوسرے روایتوں
 میں (پدرگشی) کے جرم قبیح کی اغوا کرنے والا دیوت کو بتایا
 گیا ہے جو گنوتم کا عزیز قریب اور آخر میں سخت مخالف ہو
 گیا تھا چنانچہ اس نے بودھ مت کے توڑ پر ایک مذہبی
 فرقے کی بنا ڈالی تھی جو ساتویں صدی عیسوی تک
 ہندوستان میں موجود رہا۔

مذکورہ بالا روایات میں اسی (پدرگشی) کو اجاستر

اجاستر

۱۔ اور اس باب کے تمام سین اوکس فورڈ ہسٹری اوف انڈیا مطبوعہ ۱۹۱۹ء کی
 تازہ ترین تحقیقات کے مطابق صحیح کر لئے گئے ہیں اور ان میں پہلے کی تمام انگریزی
 تاریخوں سے فرق ہے۔ مؤلف

۲۔ اس کتاب میں ہم نے ہندی کا آسان تلفظ اختیار کیا ہے اور کہیں کہیں
 اصلی یا سنسکرت تلفظ انگریزی (رومن) حروف میں لکھ دیا ہے کہ اسے پہچاننے میں

(Ajatasautr) کی پہلی جنگ کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ یہ جنگ کوسل کے راجہ سے ہوئی تھی جس کی بہن مقتول بمبار کی رانی، یعنی اجاستر کی سوتیلی ماں تھی اور اپنے شوہر ہی کے غم میں جان سے گزر گئی۔ کوسل کا راجہ بہن اور بہنوی کا انتقام لینے کے لئے آدھہ جنگ ہوا لیکن عرصہ دراز کی کشمکش کے بعد قرینہ کہتا ہے کہ غلبہ گدھ کے نوجوان راجہ کو حاصل ہوا اور کوسل کے بوڑھے فرماں روا کو دب کر صلح کرنی پڑی۔ اس قدر تو روایتوں میں بھی تحریر ہے کہ اس نے اپنے شاہی خاندان کی بیٹی اجاستر کو بیاہ دی تھی۔ لیکن بعد کی تحریروں میں کوسل کی سلطنت کا کوئی ذکر نہیں آتا اور چوتھی صدی ق م میں یہ تمام ملک گدھ کی سلطنت کا جزو نظر آتی ہے۔ پس یہ نتیجہ بعید از عقل نہیں کہ اسی جنگ نے کوسل کی قوت توڑی اور گدھ کو اس کا جانشین، یعنی قدیم ہند کی سب سے قوی سلطنت بنا دیا۔ اجاستر کی آئندہ مہات بھی مذکورہ بالا قیاس کی تائید کرتی ہیں کہ اپنے سوتیلے نانا پر فتح پا کر وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا اور گنگا اتر کر شمال میں پھویوں پر چڑھائی کر رہا تھا جن کی فوجی قوت اور ثروت کی ان دنوں بڑی دھاک تھی۔ یہ آزاد اور جنگ جو قبائل بھی گدھ کے نوخیز فاتح کا حملہ نہ روک سکے اور اجاستر نے ان کا صدر مقام ویسالی چھین لیا۔ بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اجاستر کی ماں بہن کے راجہ چلنا کی بیٹی تھی لہذا کچھ عجب نہیں کہ یہ ننھیالی

رشتہ بھی ملک پر قابض ہونے میں کار آمد ثابت ہوا ہو۔
 بہر حال اس میں کوئی شک نہیں معلوم ہوتا کہ اجاتتسر نے
 گدھ کا علاقہ کوہستان ہمالہ کے دامن تک وسیع کر دیا تھا
 اور اپنی شمالی مقبوضات کی حفاظت کے لئے، ستون اور گنگا
 کے سنگم کے پاس وہ جنگی قلعہ بنایا تھا جس کے گرد بعد
 میں پائلی پترا نامی قدیم ہند کا سب سے مشہور شہر آباد ہوا۔
 اقبال مند اجاتتسر نے غالباً ۳۲۷ ق م میں وفات پائی
 اور گو خود اس کی اولاد میں کوئی ایسا اولوالعزم راجہ نہ ہوا
 کہ گدھ کی فتوحات کا سلسلہ جاری رکھتا، تاہم جو قوت و
 عظمت اس مشرقی سلطنت نے اجاتتسر کے عہد میں
 حاصل کر لی تھی وہ بعد میں بھی کم نہ ہوئی اور اسی ملک
 کے وارث ہونے کے بعد موریا خاندان کے راجاؤں کو تمام
 ہند کے فتح کرنے کے ولولے پیدا ہوئے۔

اجاتتسر کے
 جانشین

مگر موریا خاندان کا ذکر اپنی جگہ پر آگے آئے گا۔ یہاں
 ہمیں اجاتتسر کے ان جانشینوں کے نام گنا دینے چاہئیں جو
 قیاساً ۳۱۷ ق م تک گدھ میں بادشاہی کرتے رہے۔
 ان میں پہلے دو یعنی **درسک** اور **Darsaka**

اُدکے **Udaya** کے تو کچھ حالات ملتے بھی ہیں
 لیکن ان کے بعد کے دو جانشینوں کا محض نام ہی نام باقی ہے۔
 یعنی **نندی** **وردھن** اور اس کا بیٹا **ہمانندن**۔ اور وہ
 راجہ نند جو نند خاندان کا بانی سمجھا جاتا ہے ایک بیچ ذات کی

عورت سے، اسی مہاندن کا بیٹا تھا، کم نسل ہونے کی وجہ سے وہ مند شاہی کا جائز وارث نہ تھا اسی لئے جب اس نے کسی طرح راج پر اپنا قبضہ جمایا تو ”سیس ناگ خاندان“ کا بھی کہنا چاہئے کہ خاتمہ ہو گیا اور نند (Nanda)

خاندان کی حکومت شروع ہوئی (قیاساً ۳۳۶ ق م)

نند خاندان

اس خاندان کے متعلق پڑتوں میں جا بہ جا گردشِ زمانہ کی شکایت ملتی ہے کہ آسمان کی سفلہ پروری نے ”چھتریوں“ کی بجائے ”شودروں“ کو تخت حکومت پر لا بٹھایا۔ لیکن اس کے بادشاہوں کے ٹھیک ٹھیک نام اور واقعات کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ تاہم اس بات کی بعض شہادتیں موجود ہیں کہ گو اس خاندان کے راجہ برہمنوں کے دشمن اور غالباً اپنی رعایا میں غیر ہر دلعزیز تھے، لیکن فوجی قوت کی ان کے پاس کمی نہ تھی اور ان کا مؤول ضرب المثل ہو گیا تھا۔ سکندر اعظم نے ہندوستان پر حملہ کیا ہے تو اس وقت بھی اسی خاندان کا کوئی راجہ گدھ پر حکومت کرتا تھا۔ یونانی مصنفوں نے اس کا نام ”زندراس“ بتایا ہے اور کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ اصلی نام کیا تھا۔ قدیم یونانی نام بگاڑنے میں

عل برہمنوں یا ہندوؤں کو اس خاندان شاہی سے جو نفرت تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے سمت سے وہ نوے برس کم کر دئے جس میں نند خاندان کے راجہ برہمن حکومت رہے۔ سین کے اسی طرز شمار کو ”اند“ (یعنی نند کے علاوہ) کہتے ہیں۔ دیکھو اوگسٹورڈ ہسٹری صفحہ ۵

سخت بدنام ہیں مگر زیادہ افسوس یہ ہے کہ اس بارے میں سنی سنائی اور بے ربط باتوں کے سوا کوئی ایسی روایت بھی ان کو نہیں ملی جس سے نند خاندان کی تاریخ کا سراغ لگانے میں ہمیں مدد ملتی۔ البتہ اتنا یقینی ہے کہ خبر دینے والوں نے سکندر سے جن الفاظ میں گدھ کی زبردست فوج کا بیان کیا تھا اسے سن کر مقدونیہ کے تھکے ہارے سپاہی اور بھی بددل ہوئے، اور انہوں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔

الغرض جو بڑی بھلی شہادتیں ملتی ہیں انہیں جوڑ کر جدید اہل تحقیق اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس خاندان کے نو راجہ نوے یا اکانوے برس تک فرمان روائی کرتے رہے اور غالباً ۳۲۲ ق م میں انہی کے ایک رشتہ دار (چندر گپت) نے نند خاندان کے آخری تاجدار کو معزول کر کے سلطنت پر قبضہ کر لیا اور اُس خاندان شاہی کی ابتدا ہوئی جو ”موریا“ کہلاتا ہے۔

گدھ کی تاریخ کو یہاں تک لکھنے کے بعد، مناسب ہوگا کہ ”موریا خاندان“ یا سلطنت گدھ کے آئندہ فروغ کا ذکر، ہم سکندر اعظم کے حملے کے بعد کریں اور اس فصل میں وہ واقعات ایزاد کر دیں جو پانچویں صدی ق م میں

۱۔ برہمنوں کی لمن طمن اور دیگر شواہد سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آخری نند راجہ بودھ یا یجین مت کا پیرو تھا۔ اڈکس فورڈ ہسٹری صفحہ ۵۹

ہندوستان کے شمال مغربی حصے میں گزرے اور ان کا حوالہ ہمارے دیسی یا بدیسی ماخذوں میں باقی رہ گیا تو

دارائے گنشناسب (یا اسفندار) کے کتبے کا ہم پہلے ذکر کر چکے

ایرانی فتوحات

ہیں کہ اس میں یہ ایرانی شہنشاہ اپنے مقبوضات میں ”ہندوستان“ کا نام بھی شمار کرتا ہے اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ اس کے لشکر گراں میں ہندی تیر اندازوں کا بھی ایک دستہ شامل تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایرانیوں نے اول اول سندھ اور پنجاب کے حالات دریافت کرنے کی غرض سے ایک بحری فہم روانہ کی تھی اور پھر یہ تمام علاقہ فتح کر کے، اسے دولت ایران کا ایک صوبہ یا ست رانی بنا لیا تھا، جس کی سالانہ آمدنی تین سو ساٹھ تیلنت یعنی آج کل کی دس لاکھ انگریزی اشرفی کے برابر ہوتی تھی۔ اس کی حدود کا ٹھیک پتہ نہیں چلتا مگر یہ واضح رہے کہ یہ ست رانی ایریہ (یعنی موجودہ ہرات) اراکوسیہ (یعنی صوبہ قندھار) اور گندھارا (یعنی شمال مغربی پنجاب) کے علاوہ تھی اور اس لئے موجودہ ملک سندھ اور شاید پنجاب کا وہ حصہ اس میں شامل تھا جو آج کل ”قسمت ملتان“ میں داخل ہے۔

دارپوش کے ایرانی عہدہ دار ہی اس علاقے میں مالک شام و عراق (قدیم ”ارام“) کی طرز تحریر لانے تھے جسے ”آرامی“ کہتے ہیں اور وہی مقامی تغیر و تبدل سے ”خزشتی“ تحریر بن گئی جس کے بہت سے کتبے گندھارا و نعتن میں دستیاب ہوئے ہیں۔ واضح رہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلے جو طرز تحریر (برامی) مرقع ہوئی وہ بھی اپنی آسامی مالک سے یہاں آئی تھی اور پرانی دیوناگری کے حروف اسی کی ترقی یافتہ صورت ہیں (انسانی کلو - جلد اول

تیسری فصل + تمدن اور معاشی حالات

مگدھ کے پائے تخت ”راج گاہ“ (یا راج گریہ) کے قریب گرگری نامی ایک مضبوط پہاڑی قلعہ تھا اور چھٹی صدی ق م کی پتھر کی عمارتوں میں سے اگر کسی کے کچھ آثار باقی رہ گئے ہیں تو وہ اسی قلعہ کے، جس کا دور ساڑھے چار میل کے قریب تھا۔ قدیم کتابوں سے مستحکم برج و حصار اور شہر پناہ کے عالیشان دروازوں کا سراغ ملتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فصیلوں کے گرد دھس اور پھر چوڑی چوڑی خندقیں بنائی جاتی تھیں لیکن غالباً یہ شہر کے اندرونی قلعوں کا بیان ہے جن میں شاہی محل اور قلعہ کی فوج رہتی ہوگی۔ پروفیسر رہس ڈیوڈ جس کی کتاب بدهٹ انڈیا کے بعض ابواب سے ہم نے اس فصل کے لکھنے میں استفادہ کیا ہے) کا خیال ہے کہ شہر کی اصلی آبادی، لوگوں کے مکانات اور بازار ان قلعوں کے باہر ہوتے تھے اور ہندوستان کے بعض پرانے قصبوں میں آج بھی آبادی کا یہی نمونہ موجود ہے۔ چوتھی صدی ق م میں شاہی عمارت کی جو صورت ہوتی تھی، اس کا یونانی سفیر مگاس تھینز نے تفصیل سے حال بیان کیا ہے اور اس کا ضروری خلاصہ ہم اپنی پہلی کتاب میں لکھ آئے ہیں۔ لیکن یہاں ہمیں راجہ ہساراجوں کے

شہر اور
عمارت

محلّات کی بجائے عوام الناس کے مکانات کا مطالعہ کرنا ہے تاکہ اس عہد کی معاشرت کا ٹھیک اندازہ ہو سکے۔
 ہماری اس معلومات کا ماخذ بیش تر وہ نفاذی کتب و روایات ہوں گی جن میں ضمناً شہر اور شہر کے مکانات کا ذکر آگیا ہے۔ اور یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اس زمانے میں شہر صرف ذاتی مکانات و دکانات کا مجموعہ ہوتا تھا اور اس قسم کی عمارتیں شاذ و نادر ہی نظر آتی تھیں جنہیں لوگوں کا مال مشترک سمجھا جائے۔ منادر و معابد کا ابھی تک رواج نہ تھا اور سرکاری کاروبار راجہ کے محل میں انجام پاتے تھے۔ ان کے لئے نہ کوئی دفتر ہوتا تھا نہ کچہری۔ البتہ بالعموم بعض چوراہوں پر یا شہر کے باہر اس قسم کے ”آگ سنان“ یا ”سیوتھکا“ کے گنبد بننے لگے تھے جن میں کسی مشہور آدمی کی راکھ یا ”بھسمی“ دفن ہوتی تھی اور گو ایسی کسی عمارت کے کھنڈر بھی اس حالت میں باقی نہیں ہیں کہ ان کا کوئی صحیح خاکہ پیش کیا جاسکے تاہم اتنا پتہ چلتا ہے کہ بعض اوقات یہ گنبد بہت بڑے بنائے جاتے تھے اور ان میں پتھر یا اینٹ بھی لگائی جانے لگی تھی۔ لیکن یہ مسالا اس زمانے میں عام طور پر استعمال نہ ہوتا تھا بلکہ رہنے کے مکانات لکڑی سے بنائے جاتے تھے اور ان کے اندر باہر چوڑے کا صنلا کر دیا جاتا تھا اور نقاشی اور مصوری کی جاتی تھی جس کے بعض لاجواب نمونے گواہی دیتے ہیں کہ ان دنوں ہندوستان میں

یہ فن بہت کچھ ترقی کر گیا تھا؛
 آج کل انگریزوں کی دیکھا دیکھی ہمارے ہم وطن ایسے
 مکانات بناتے ہیں کہ بیچ میں رہنے کی عمارت، اور ادھر ادھر
 صحن ہوتا ہے۔ دراصل یہ مسلمانوں کے باغ اور بارہ دری کی
 نقل ہے ورنہ سکونت کے مکانوں کا عام نقشہ جو اس ملک
 میں بہت قدیم سے چلا آتا ہے، یہی ہے کہ چاروں طرف مکان
 اور بیچ میں صحن رکھتے ہیں۔ یہی طرز چھٹی صدی ق م میں تھی
 اور عام طور پر دو منزلہ مکانات بنائے جاتے تھے جن کی
 کھڑکیاں باہر گلی یا بازار میں کھلتی تھیں۔ عوام الناس اور غریبوں
 کے مکان خس پوش اور یک منزلہ ہوتے تھے اور معلوم ہوتا
 ہے کہ ان دنوں شہر میں کثرت اسی قسم کے مکانات یا
 چھپروں کی ہوتی تھی؛

مکانات کا
عام طرز

لیکن اس بات کے تحریری ثبوت موجود ہیں کہ ان "تنگ
 و بودار مکانوں" کے رہنے والے بھی معاش کے اعتبار سے
 مطمئن اور آسودہ حال تھے۔ ہندوستان زرعی ملک ہے اور
 اُس زمانے میں بھی یہاں کی زیادہ آبادی دیہات میں رہتی اور
 زراعت پر گزارہ کرتی تھی۔ کاشت کے لئے زمین کی کچھ کمی نہ
 تھی اور جہاں تک معلوم ہوا، نہ صرف کسان بلکہ چرواہے
 اور گلہ بان بھی ان دنوں آزادی اور کمال فراغت سے زندگی
 بسر کرتے تھے۔ مزدوری کا پیشہ، یعنی اجرت پر دوسرے کی
 خدمت کرنا موجب تنگ اور پرنصیبی کی علامت سمجھا جاتا تھا

معاشی
حالت

لوٹری غلاموں کا پرانی کتابوں میں جا بہ جا ذکر آتا ہے لیکن
قارئین کہتے ہیں کہ یہ زیادہ تر بڑے اُمرا کے پاس شہروں
میں ہوتے تھے اور غالباً ہند کی قدیم دراوڑی نسل کے
افراد تھے؛

شمالی ہند کے شہروں کا شمار چودہ، پندرہ یا اس کے
قریب قریب تھا اور اگرچہ اُن کی آبادی کا تخمینہ محال ہے
اور اُس زمانے کے شہر اور قصبے میں امتیاز کرنے کا
کوئی عمدہ ذریعہ نہیں، تاہم بعض شہر بہت با رونق اور آباد
تھے اور اُن میں متمول سوداگر بتے تھے جن کا تجارتی
مال بیل گاڑی میں یا کبھی کبھی کشتیوں پر دُور دُور تک
آتا جاتا تھا۔ راہ داری کے محصولات اس زمانے میں ایسے
سخت تھے کہ صرف قیمتی اشیاء ہی کی درآمد برآمد ممکن تھی۔
دوسرے نہ سڑکیں تھیں نہ اس قدر آبادی کہ مال کا حفاظت
ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا آسان ہو۔ راستے کی
حفاظت کے واسطے خود سوداگروں کو سپاہی ساتھ کرنے
پڑتے تھے اور اپنی بالائی مصارف کے باعث تجارت کا
مال صرف ریشمی، باریک سوتی یا کام دار کپڑے اور زیورات
پر مشتمل ہوتا تھا؛

علا سکہ بھی ابھی تک سرکاری طور پر رائج نہیں ہوا تھا۔ البتہ خود سوداگروں کے
دھالے ہوئے مسی سکتے اور ہنڈوئیاں عام طور پر چلتی تھیں؛ ۱۲

لباس، زیورات اور ظروف کے حالات پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ چھٹی صدی ق م میں اہل ہند خاصے دستکار ہو گئے تھے۔ مثال کے طور پر خود ہمارے زمانے کی دیہاتی معاشرت میں دیہاتیوں کو جس قسم کے لباس اور اسباب تکلفات کی ضرورت پڑتی ہے وہ اُس وقت بھی غالباً کوہی یا بنارس کے بازاروں میں فراہم ہو سکتے تھے۔ ان قدیم صنعتوں (خاص کر زیورات) کے جو نمونے موجود ہیں وہ کچھ بہت بھدے نہیں اور اِس زمانے کی دیہاتی صنعتوں سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا قدامت پرست ملک آج بھی ضروریات تمدن اور ذوق آرائش کے اعتبار سے قریب قریب اسی عالم میں ہے جس میں ڈھائی ہزار برس پہلے مگن تھاء

پیشہ ور سپاہی اور سرکاری ملازمت کرنے والوں کو چھوڑ کر اہل حرفہ کی دس بارہ قسمیں بتائی گئی ہیں، فیلبان، رتھ بان، دھوہی، جام ان کے علاوہ ہیں، ان پیشہ وروں کی اُسی زمانے میں باقاعدہ ذاتیں بن گئی تھیں بلکہ شہر کے اندر یا بیرونی علاقے میں ان کی ہر برادری گویا ایک چھوٹی سی قوم ہوتی تھی جو اپنے معاملات اور قضئے خود چکاتی اور گاؤں کی پنچایتوں کی طرح اپنے برادری والوں کو سزا دینے کی مجاز تھی -

۱۔ خود گاؤں کی آبادی اُس زمانے میں ایک برادری یا ایک خاندان کے افراد پر مشتمل ہوتی تھی ۲۔

برادری کے چودھری یا مکھیہا بہت معزز مانے جاتے تھے اور بعض اوقات خود راجہ کے دربار میں ان کا بڑا رسوخ ہوتا تھا۔ اوپر کے بیان کو پڑھ کر یہ بات از خود ذہن میں آجاتی ہے کہ ہندوستان میں اس ذات بندی کا بیج اسی وقت پڑ چکا تھا، جسے آج کل اکثر مصلحین قومی اشجاد کا سب سے سخت دشمن جانتے ہیں۔ پھرتی، برہمن، ویش اور شودر کی تقسیم اگرچہ علی طور پر مکمل نہیں ہوئی تھی اور نہ ان چاروں گروہوں کا مرتبہ اتنی پختگی سے معین ہو سکا تھا، جیسا کہ چند صدی بعد نظر آتا ہے، تاہم یہ امتیازی نام قدیم سے قدیم ہندوستانی کتابوں میں موجود ہے، اور سب سے زیادہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ دورِ قدیم میں اس تقسیم کی بنیاد رنگ اور نسب پر تھی یعنی جو لوگ زیادہ گورے اور صاف رنگ کے تھے، نیز جن کا سات پشت تک نسب معلوم اور بے داغ ہوتا تھا، وہ سب سے شریف اور اعلیٰ ذات کے لوگ مانے جاتے تھے۔ اور دوسرا درجہ اس برہمن یا پوجاری کا تھا جس کے خاندان میں پوجاپاٹ کا پیشہ موروثی ہوئے دوسرے لفظوں میں، چھٹی صدی تک برہمنوں کو اولیت کا مرتبہ حاصل نہ ہوا تھا اور سب سے اعلیٰ ذات چھترلوں کی تھی جس کے یہی معنی نہیں کہ ابھی تک آریوں میں جنگ و جدال اور انتظامی قابلیت کی قدر و قیمت زیادہ تھی اور مذہبی پیشواؤں کا تسلط پوری طرح قائم نہیں

ذات و رنگ کا امتیاز

ہوا تھا؛ بلکہ جیسا کہ بعد کی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے۔
خود ریاضت و خدا طلبی اور ذہانت و فکر حکیمانہ میں بھی برہمن
اُن سے افضل نہ تھے؛

چھتری اور برہمنوں کے بعد تاجر، اور آزاد کسانوں کا
گروہ یعنی آبادی کا متوسط طبقہ ”ویش“ کہلاتا تھا اور اہل
حرف یا مزدوری کرنے والے ”شودروں“ کے آخری گروہ میں
داخل تھے جو بالعموم کالے رنگ کے غیر آریا لوگ تھے۔
پروفیسر ریس ڈیوڈ لکھتے ہیں کہ ان چار ذاتوں کے نیچے بھی
چند اور ذاتیں تھیں اور ٹوکری بے، چڑھیار، نلی، کھار، جلائے
چار وغیرہ ادبے پیشہ وروں کا شمار ان میں ہوتا تھا اور
ذیل اور قابل نفرت ہونے کے لحاظ سے سب سے آخری درجہ
چنڈال اور پکس کا تھا جو ہند کے قدیم اور اصلی باشندے
تھے؛ مگر اس اعتبار سے کہ یہ ”شودر“ اور ”چنڈال“ بھی
آزاد تھے، آبادی کا سب سے پست اور بد نصیب گروہ ان
غلاموں کو کہنا چاہئے جو کسی جنگ یا تاخت میں گرفتار ہوئے
یا کسی جرم کی سزا میں اُن کی آزادی چھین لی گئی۔ ان غلاموں
کی اولاد بھی غلام ہوتی تھی اور وہ اپنے آقا کی ملک ہی

شودر اور
اہل ذاتیں

مطبع پبلسٹری، صفحہ ۵۴۔ لیکن اس رے کے تسلیم کرنے میں تاثر ہوتا ہے کہ
کہ مہادا فاضل پروفیسر کو ”ہین جات“ کے لفظ نے مغالطے میں ڈالا ہو جو اب
بھی بعض ادبے پیشہ وروں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ مگر یہ ضرور نہیں کہ انہیں
”شودروں“ سے کم درجہ سمجھا جائے؛ ۱۲

جاتے تھے۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ ممالک ایشیا میں غلاموں پر وہ جور و ظلم کسی قوم نے جایز نہیں رکھے جو یونان یا رومہ کی قدیم تاریخ میں ہماری نظر سے گزرتے ہیں۔ نرمی کی وجہ اہل ایشیا کی ثروت و استغنا ہو یا غلاموں کی بہتات، اس میں کچھ شک نہیں کہ ان ملکوں میں غلاموں کے ساتھ معمولی نوکروں کا سا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ دوسرے جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس وقت ہندوستان میں غلاموں کی تعداد بھی غالباً بہت کم تھی۔

باب سوم

پہلی فصل - مذہبی مقصدات

بودھ مت کی قدیم کتاب ”دیگھ“ نامی میں ایک نظم محفوظ ہے جس میں شاعر گنوم بودھ کی مدح و ثنا کرتا ہے اور اسی ضمن میں ہندوستان کے اُن دیوی دیوتاؤں کو گنواتا ہے جو اُس کے مدوح کے سامنے سر عقیدت خم کرنے حاضر ہوئے۔ مؤرخ کی نگاہ میں ارادت مند شاعر کی یہ فہرست بہت کار آمد ہے کیونکہ اس سے یہ سراغ چل سکتا ہے کہ اس وقت (پانچویں صدی ق م) ہندوستان میں کن کن دیوی دیوتاؤں کی پرستش ہوتی تھی :-

اس فہرست میں سب سے اول دھرتی مانا اور پہاڑوں کی دیویاں آتی ہیں اور اس کے بعد چار سمتوں کے چار بادشاہ (یا دیوتا) پھر گندھرو یعنی آسمانی مطرب پھر ناگ دیوتا، جن کی بہت سی قسمیں تھیں۔ پھر گروں دیوتا یعنی انسان چہرہ پرند جو ناگوں کے دشمن مانے جاتے تھے۔ پھر عفریتوں کا ایک گروہ، جن کی پوجا ہوتی تھی اور چاند سورج، آندھی، بادل، روشنی، گرمی کی دیویاں وغیرہ۔

قدیم مہود

اور آخر میں اُن دیوتاؤں کا نام ہے جو بہت سی صفات سے متصف مانے جاتے تھے جیسے برہما، پرتی وغیرہ اس طویل فہرست میں ”روکھ دیوتاؤں“ کا نام نہیں آیا۔ لیکن دیگر ذرائع سے یہ بات پائے تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ چھٹی (اور نیز پانچویں) صدی ق م میں بہت سے درختوں کی پوجا ہوتی تھی اور ان کی نشوونما اور ہریاؤں کا سبب ہی ان کے اندر کسی روح یا مانا کو مانا جاتا تھا، جس کے چولا بدلتے ہی درخت کی عمر بھی تمام ہو جاتی اور وہ سوکھ کر گر پڑتا تھا۔ اس فروگذاشت سے قطع نظر، خاص طور پر قابلِ غور یہ امر ہے کہ اس فہرست میں ”رگ وید“ کے سب سے قدیم اور بڑے دیوتاؤں (یعنی اندر، اگنی، وایو اور ورن) کا کچھ ذکر نہیں حالانکہ بہت سے ایسے معبودوں کا نام ملتا ہے جن کا ویدوں میں نام تک نہیں آیا۔ ان دونوں باتوں سے یہ نتیجہ (جس کی اور طرح بھی تصدیق ہوتی ہے) نکالنا کچھ دشوار نہ ہوگا کہ ہندوستان کے باشندوں میں ابھی تک بڑا گروہ آریوں کے خاص خاص دیوتاؤں کو نہیں مانتا تھا بلکہ ایسے معبودوں کی پوجا کرتا تھا جن سے خالص آریا اول اول واقف نہ تھے؛

مذہب کی اس دو رنگی کا بڑا سبب یہ ہوا کہ ہندوستان کے آریوں کے عقائد

کے آریا فاتح خاص یہاں کے باشندے نہ تھے بلکہ غالباً

دوسرے ہزار ق م کے دور میں باہر سے آئے اور اپنے مذہب کے بنیادی عقائد اپنے ساتھ لائے تھے۔ چنانچہ رگ وید کے سب سے پرانے بھجن جن دیوتاؤں کی مع و ثنا کرتے ہیں ان کا قدیم ایرانیوں کی مذہبی کتاب اوستا میں بھی ذکر موجود ہے۔ لیکن ہندوستان میں آنے کے بعد ان عقائد میں بہت کچھ تغیر ہو گیا تھا۔ خاص جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں، اس وقت یہ ظاہر ان کے رشی یا اہل فکر مسئلہ ”وحدت فی الکثرت“ کی منزل تک پہنچ چکے تھے جس کا خود رگ وید کے آخری زمانے کے بھجنوں نے کم سے کم راستہ دکھا دیا تھا، لیکن رگ وید یا اس کے وہ تفسیری اُپنِ خد جو بودھ مت کے آغاز سے پہلے کے ہیں، مذکورہ بالا مسئلہ کا حل اس طرح کرتے ہیں کہ آگنی کو جو حرارت و نور و رطوبت کا مبداء ہے، تمام دیوتاؤں کا دیوتا بتاتے ہیں اور سب دیوتاؤں میں اسی کا جلوہ دکھاتے ہیں۔ کائنات کی ہر شے میں ظاہر یا باطن وہ موجود ہے اور تمام حرکت و حیات اسی سے ہے۔ بایں ہمہ یہ باتیں کچھ ایسے شاعرانہ پیرائے میں کہی گئی ہیں کہ غالباً رگ وید کے ماننے والوں نے کبھی آگنی کو

نہ چنانچہ ایک بھجن کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوتا ہے کہ ”سب دیوتا آگنی ہے!“ مفصل

بحث کے لئے ملاحظہ ہو ”ویدک انڈیا“ کا آخری باب ۶ ۱۱

”خدائے واحد“ نہیں سمجھا اور نہ اُس کی اُن صفات کی پوری طرح صراحت ہوئی جن سے اس کی ”ربوبیت“ کا مفہوم صاف ہو جاتا، اور نہ دوسرے دیوتاؤں کے، اپنی اپنی جگہ پر، اختیارِ مطلق میں کوئی کمی آئی کہ لوگ ان کی پرستش چھوڑ کر ایک خالقِ کل یا فاعلِ حقیقی سے نو لگاتے، ممکن ہے کہ اس نارسائی کا سبب عقولِ انسانی کی خامی ہو۔ ممکن ہے کہ خود وید کی مجموعی تعلیم ہی شریک فی العبادت یا اربابِ پرستی (Polytheism) کی تقویت کا باعث ہوئی ہو۔ کیونکہ اس میں کچھ کلام نہیں کہ رگ وید میں زیرِ بحث قسم کی توجیہ بھی نہ تو ہر جگہ ہے اور نہ اسے صفائی کے ساتھ زور دے کے بیان کیا گیا ہے۔

قریبانی اور
ریاضت

بہر حال، یہ دو سبب ہوں یا ان کے سوا اور، ہمارے زیرِ نظر عہد میں اہل ہند متعدد خدا مانتے تھے اور ان کی پرستش کے واسطے مندر نہیں تھے، نہ غالباً ابھی بت تراشی کا آغاز ہوا تھا، بلکہ کھیت یا باغ میں وقت کے وقت ”قریان گاہ“ بنالی جاتی تھی اور مالکِ زمین یا صاحبِ خانہ کی طرف سے پروہت دیوتا کے نام پر جانوروں کی بھیٹ دینا اور دعائے خیر مانگتا تھا۔ اس بھیٹ کا فائدہ (یا ثواب) ان کے عقیدے میں صرف مالکِ زمین کو پہنچتا تھا اور دیگر مصارفِ قریبانی کے علاوہ اسے پروہتوں کو بہت معقول معاوضہ دینا پڑتا تھا۔ قرینہ کہتا ہے کہ اول اول اسی شرط اور برہمنوں کی

زیادہ طلبی نے لوگوں کو، قربانی کی رسم سے بد دل کیا اور
عجب نہیں کہ تہیدستی کی وجہ سے وہ برہمنوں کی مشرٹوں
نہ پوری کر سکے ہوں تو حصول مراد یا کفارہ گناہ کے لئے
اپنے کسی معبود کے پیکر خیالی کے روبرو گڑ گڑاے ہوں اور
تہنائی میں رو رو کر دعائیں کرنے لگے ہوں! قربانی سے
محروم، شکستہ دل اہل طلب کی یہی خلوت گزینی، یہ ظاہر
عبادت کے دو قدیم طریقوں کی تہید تھی یعنی اسی شے نے
ایک طرف جذبہ مبت تراشی کی پرورش کی اور دوسری طرف
ریاضتِ شاقہ میں اطمینانِ نفس کا سامان پیدا کر دیا۔ پہلا
موضوع خارج از بحث ہے، کیونکہ یہاں ہمیں صرف اس دلچسپ
واقفے پر توجہ دلانا منظور ہے کہ رفتہ رفتہ بھیٹ اور بھیٹ
چڑھانے والے تپسیا (ریاضت) سے مغلوب ہو گئے اور خود
برہمنوں کے مصنف پکار اٹھے کہ آسمان ہوا پر، ہوا زمین پر،
زمین سمندروں پر قائم ہے، اور پانی کا قیام صداقت پر
ہے، صداقت کا (قربانی کے) منتروں پر اور خود منتروں کی بنیاد
پس پر ہے!“ (چھٹی برہمنہ ۱۱)

واضح رہے کہ وید کی وہ شریں جو برہمنوں کے نام سے
موسوم ہیں، خود برہمنوں ہی کی تصنیف سے ہیں اور ان میں
قربانی کی رسموں اور منتروں کا ذکر ہے، جو گویا ویدی دیوتاؤں
کو خوش کرنے کے لئے پڑھے جاتے تھے۔ اور جب انہی
میں تپس یا تپسیا کی فوقیت مان لی گئی ہو تو پھر خیال

ہوتا ہے کہ بھیٹ کا حامی کوئی نہ رہا ہوگا۔ اس میں توشک نہیں کہ ادنیٰ اور اعلیٰ ہر قسم کے آریوں کا ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا تھا جس کی نگاہ میں بھیٹ پوجا کی کوئی وقعت نہ رہی تھی اور اس گروہ کے افراد ذہانت اور اخلاق میں برہمنوں پر ایسی نمایاں برتری رکھتے تھے کہ نہ صرف عوام الناس بلکہ خود برہمنوں کو یہ فوقیت تسلیم کرنی پڑتی تھی حتیٰ کہ بعض برہمن خود بھی انہی تپسویوں کے کٹی یا جزوی طور پر ہم خیال ہو جاتے تھے۔ اور اسی قسم کے برہمنوں نے تپس کی وہ بڑائیاں کی ہیں جن کا ایک نمونہ اوپر نقل ہوا۔ بایں ہمہ سارے برہمنوں کی یہ رائے نہ تھی۔ تپس کی وجہ سے اپنی کساد بازاری اور لوگوں میں تپسویوں کی عزت دیکھ دیکھ کر وہ حسد کرتے تھے مگر ان کا کچھ زور نہ چلتا تھا اور انہوں نے اپنی اور قربانی کی رسموں کی عظمت بحال کرنے کے لئے جو کچھ ہاتھ پاؤں مارے، اس میں بھی چنداں کامیابی نہیں ہوئی۔ تاہم اسی جدوجہد نے آپن شد کا ایک بڑا ”فلسفہ روحانیت“ تیار کر دیا۔

یہ روح کا مسئلہ ہے جس پر غور و غوض کرنے کا یہ بھی ایک سبب ہوا کہ برہمن اپنے پُر اسرار منستروں کے باطنی اثرات سمجھنا اور سمجھانا چاہتے تھے تاکہ اہل ریاضت کے مقابلے میں ان کو شکست فاش نصیب نہ ہو۔ انہوں نے اس بارے میں بیان کے نہایت دقیق پیرائے اختیار

کئے ہیں اور اس میں جا بہ جا تضاد و تخالف بھی پایا جاتا ہے۔ مگر سادہ لفظوں میں ان کے اس عقیدے کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر جسم کی حرکت و حیات کا باعث روح ہے جسے وہ کبھی اُون سے تشبیہ دیتے ہیں۔ کبھی بجلی کی چمک سے اور کبھی ”نورِ بے دود“ سے۔ اگرچہ اس کے اجزائے ترکیبی میں غیر مادی صفات و خواص کے ساتھ ہم مادی عناصر (خاک و آب) کے نام بھی پاتے ہیں۔ بہر حال وہ جس سے بھی بنی تھی اس کے متعلق دو باتیں قابلِ لحاظ ہیں:۔ اول تو یہ کہ بعض مقامات پر اپنی شدوں میں یہ بات نہایت صفائی اور وضاحت سے بیان کی گئی ہے، کہ جذبات و شعور روح کی خصوصیات میں ہیں اور جب (حالتِ خواب یا موت کے وقت) روح نکل جاتی ہے تو جسم انسانی ان دونوں سے محروم ہو جاتا ہے۔ لیکن دوسرا اور زیادہ اہم عقیدہ، جس سے اپنی شدوں میں کہیں بھی اختلاف نہیں کیا گیا، یہ ہے کہ روح کو ”آواگون“ سے نہ تپتیا نجات دلا سکتی ہے نہ بھیٹ بلکہ یہ مرتبہ اُسے صرف اس وقت حاصل ہوگا جب کہ وہ اپنی روح کو اُس ”روحِ اعظم“ کا جزو لائیک محسوس کرنے لگے، جو تمام کائنات کی جان یعنی سب سے اعلیٰ روح یا پرماتماں ہے۔ ازل سے تھی اور ابد تک قائم رہے گی؛

یاد رکھنا چاہئے کہ اقول ہی اول وہ آتماں، یا انسانی روح کا خیال پیدا ہوا تھا۔ اور جہاں تک تحقیقات جدید کا دخل ہے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ”پرماتماں“ کے عقیدے نے بعد میں تکمیل پائی جیسا کہ خود اس لفظ سے ثابت ہے (پرہم = اعلیٰ + آتماں = روح) لیکن اس دقیق و ہمہ گیر عقیدے تک پہنچنے کے بعد یہ قدرتی بات تھی کہ اس ”روح کائنات“ اور اُن ہستیوں میں قویٰ تعلق مانا جائے جو ذی روح (یعنی صاحب ارادہ) تسلیم کی جاتی تھیں۔ چنانچہ تمام دیوتا اور انسانوں کی روح کا مبداء اسی ہستی گہری کو ماننے لگے خاص کر انسان کی روح کے متعلق یہ اعتقاد جم گیا کہ جسم خاکی میں وہی پرماتماں جلوہ گر ہے جس کی بہ دولت انسان، انسان بناؤ

مگر اس عظیم الشان تخیل کے اپن شدوں میں موجود ہونے سے یہ قیاس نہ کرنا چاہئے کہ یہ فلسفہ برہمن یا پروہتوں کی سنی فکر کا نتیجہ ہے۔ اس کے برعکس ہمارے پاس بہت سی شہادتیں موجود ہیں کہ گو برہمنوں نے ”پرماتماں“ کے عقیدے کو بودھ مت کے آغاز سے پہلے اپنے مذہب میں داخل کر لیا تھا، بایں ہمہ وہ یا ان کے مقلد اس کے بانی نہ تھے بلکہ یہ دوسرے اہل فکر کا کام تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب خود اس (پرماتماں کے) عقیدے پر گفتگو شروع ہوئی تو برہمن اپنے مذہب کی کچھ اچھی وکالت نہ کر سکے اور دوسرے فلسفیوں نے اس عقیدے میں طرح طرح کے شاخسانے نکالے بلکہ آخر میں ایک گروہ (یعنی بودھ مت والوں) نے ”روح“ کا وجود ہی ماننے سے انکار کر دیا۔

دوسری فصل - چین مت

عالم افکار میں جس تلامذہ کا ہم نے پہلی فصل میں اشارہ کیا ہے اس کا آغاز ان جنگلوں میں ہوا جہاں حکیمانہ دماغ کے لوگ، دنیا اور اہل دنیا سے الگ ہو کر، "راز دہر" کی جستجو میں منہمک تھے۔ اس قسم کے راہبوں کا ہندوؤں کی قدیم سے قدیم کتاب میں ذکر موجود ہے۔ کم سے کم، پیش نظر زمانے میں رہبانیت ایک معروف طرز زندگی بن گئی تھی۔ آبادیوں سے کچھ ہٹ کر جا بہ جا صحرائشین راہبوں کے مسکن ہوتے جن میں کہیں استغراق و محویت اور کہیں خوف انگیز ریاضتوں کے منظر دکھائی دیتے تھے؛ لیکن بہت سے راہب، ترک دنیا کے باوجود باقاعدہ تعلیم کا مشغلہ کرتے تھے اور حکمت و علوم الہیہ کے سیکھنے والوں کا ان کے ہاں جمع رہتا تھا۔ بنے بنے اول اول اس درس و تدریس کا منشا وید کو حفظ کرانے کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ لیکن رفتہ رفتہ درس کا میدان وسیع ہوا تو بحث و موشگافی کے ہزاروں پہلو نکل آئے اور اب استادوں کا صرف یہی کام نہ رہا کہ وید کے بھیجنے سناویں اور شاگردوں کو اچھی طرح یاد کرا دیں، بلکہ انسان، خدا، اور آفرینش کے اہم مسائل پر بھی وہ بڑی بڑی تقریریں کرنے لگے اور اسی منزل میں پہنچ کر ان میں لازمی طور پر بہت سے اختلافات

نشانیہ

پیدا ہو گئے۔ چنانچہ جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں، اس میں ایسے کئی گروہ یا مذاہب کا پتہ چلتا ہے جس کے پیرو معاش و معاد کے متعلق بالکل جداگانہ رائے رکھتے تھے۔ ان کے باہمی مناظروں کی بھی بعض روایتیں محفوظ ہیں اور معلوم ہوتا ہے انہی نئے نئے خیالات کو پھیلانے کے جوش میں بہت سے راہبوں نے اپنی زاویہ نشینی چھوڑ کر سیاحت و جہاں گردی اختیار کر لی تھی اور انہیں ”پرباجکا“ کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ چونکہ یہ لوگ عام طور پر آزاد خیال اور برہمنوں کی نظر میں ٹمہ ہوتے تھے اس لئے ”پرباجکا“ میں تارک الدنیا جہاں گرد ہونے کے ساتھ ٹمہ ہونے کا مفہوم بھی شامل ہو گیا تھا۔

اس کتاب میں ان سب گروہوں کے حالات و عقائد کا پتہ لگانا، بے محل طوالت کا موجب ہوگا کیونکہ ان میں سے اکثر کا صرف نام ہی نام بعض پرانی کتابوں میں باقی رہ گیا ہے۔ البتہ اس جگہ ان دو مذاہبوں کا ذکر کرنا ضروری ہے جنہوں نے قدیم ہندوؤں کے تمدن و افکار پر اثر ڈالا اور جن کے

معا چونکہ یہ سنے گروہ زیادہ تر گدھے یا اس کے شمال مغرب ہمسایہ علاقوں میں پیدا ہوئے تھے، جہاں کی آبادی خالص آریہ نسل کی نہ تھی لہذا وراثت سمجھ کی یہ رائے بھی قابل لحاظ ہے کہ یہاں کے اعلیٰ طبقے میں غیر قوم کے برہمن وہ مذہبی اقتدار نہ پا سکے جو انہیں اپنے ہم قوم آریوں میں حاصل تھا پس ان کی دینی تعلیم اور عقائد سے یہاں کے آزاد خیال اُمراء (یا پجترہوں) نے انحراف کیا اور یہ دعویٰ نہ مانا کہ ان اجنبی برہمنوں کے سوا کوئی علم و حکمت سے آشنا نہیں ہو سکتا نہ نجات حاصل کر سکتا ہے۔ (اوکسفورڈ ہسٹری مطبوعہ ۱۹۱۹ء صفحہ ۴۱۹)

نام لیوا اب تک ہند یا بیرون ہند میں موجود ہیں تڑ
 ان دونوں میں تقدم جین مت کو حاصل ہے جس کا
 بانی **وودھ مان** **جہاسیر جناتری پتر**
 (Vardhamana mahvira Jnatriputra)
 ہوا ہے۔

وودھ مان
 جہاسیر کا
 مذہب

اس نامور ہندی کے ذاتی حالات کو قدامت نے اس قدر
 دھندھلا کر دیا ہے کہ افسانہ و قصص کے انبار میں کوئی بات
 قابل اعتبار ملتی ہے تو وہ یہ کہ **جہاسیر ویسالی** کا چھتری
 امیر زادہ تھا اور چھٹی صدی (ق م) کے آخر یا پانچویں صدی
 کے شروع میں اس نے گدھ دیس ہی میں وفات پائی۔
 بالفاظ دیگر وہ راجہ بمبسا اور اپنے نامی تر حریف گوتم بودھ
 کا نہ صرف ہم عصر گزرا ہے بلکہ اس کی زندگی بھی زیادہ تر اسی
 علاقے میں بسر ہوئی جو گوتم کا مولد و منشا تھا پڑ
 لیکن **جہاسیر** نے جو تعلیم دی وہ نہ صرف مختلف بلکہ ایک
 حد تک بودھ مت کی ضد ہے، اور اس کے مذہب کا بنیادی
 اصول ہی یہ تھا کہ ہر ذی حیات و غیر ذی حیات حتی کہ باد
 و آتش میں بھی روح ہے (حالانکہ بودھ مت والے روح سے
 مطلق شرکار نہیں رکھتے) البتہ تپسیا کا وہ بھی ایسا ہی معتقد تھا
 جیسا کہ اس کے دوسرے معاصرین چنانچہ اس کا یہ قول
 مشہور ہے کہ ”جسم کو مغلوب کر اپنے نفس کو مار اور اپنے
 آپ کو اس طرح بے دم کر دے جس طرح آگ سوکھی کٹری کو
 جلا کے کر دیتی ہے“

اصول و
 عقائد

اسی ضمن میں کسی ”جیو“ کو تکلیف پہنچانے کی سخت
 حمانعت کی گئی ہے اور چونکہ ”جیو“ (یعنی روح) سے جینیوں
 کے عقیدے میں کوئی چیز خالی نہیں لہذا اچھا جینی وہی
 شخص بن سکتا تھا جو نہ صرف فائدہ کشی اختیار کرے بلکہ
 ”جان آزاری“ کے خوف سے دانت تک نہ مانجھے اور
 کپڑا بھی نہ دھوئے بلکہ ممکن ہو تو بالکل استعمال ہی نہ کرے۔
 چنانچہ اس مذہب کے معتقد اسی بنا پر ”دیگر“ کہلاتے تھے
 کہ ان کے جسم پر کوئی کپڑا نہ ہوتا تھا اور مکاس تھنیز یونانی
 نے بھی انہیں ”جنوسوفٹ“ (یعنی حکمائے عربوں) کا خطاب
 دیا ہے جو بعد کے یونانی مصنفین کے ہاں محفوظ رہا لیکن
 عقائد کے اعتبار سے جینیوں کا سب سے عجیب مسئلہ
 ”سیارواد“ کا اصول ہے جس کی رو سے ہم ایک ہی
 وقت میں جس بات کا چاہیں اقرار و انکار دونوں کر سکتے
 ہیں اور اس سے ہمارے مذہبی مقدمات میں کوئی خلل نہیں
 آتا اور نہ عقل کا قصور ثابت ہوتا ہے! مثلاً ہم عالم کے
 حدوث اور قدم دونوں کے قائل ہو سکتے ہیں اور اس کی
 تاویل یوں ہو جائے گی کہ ”علم ایک طرح سے قدیم ہے اور
 ایک طرح سے دیکھنے تو حادث ہے!“

ظاہر ہے کہ اس قسم کے مبہم عقائد اور سخت قیود عام طور
 پر قبولیت نہیں پا سکتے اور یہی سبب ہے کہ ہندوستان میں
 جین مت کو زیادہ فروغ کبھی حاصل نہیں ہوا۔ اور کچھ عرصے بعد

اس کے عملی اصول میں بھی ترمیم کرنی پڑی۔ چنانچہ گوجینیوں کے مندروں میں آج تک بتوں کو بالکل برہنہ بناتے ہیں لیکن ایسے عقیدت مندوں کی تعداد بہت کم ہوگی جو خود اسی شمار پر قائم ہوں اور جنھوں نے دینوی لذات کے ساتھ لباس بھی ترک کر دیا ہوگا

تیسری فصل۔ ساکی منی گوتم اور بودھ مت

جیسا کہ نام کے پہلے ٹکڑے سے ظاہر ہے گوتم بودھ قبیلہ ساکی یا ساکیا کا فرد تھا اور یہ وجین قوم کا وہ قبیلہ ہے جس کے دائرہ حکومت میں موجودہ ریاست نیپال اور کسی قدر جنوب کا علاقہ شامل ہوگا۔ ان دنوں اس قبیلے کا صدر مقام کپیل وست (Kapilavastu) موجودہ ضلع بستی کے شمال میں (عرض بلد شمالی ۲۷° ۳۷' کے قریب) واقع تھا اور اس میں جمہوری طرز کی "حکومت شرفاً قائم تھی۔ سدھودن کو شرفا کے اسی حکمران طبقے کا ایک رئیس بتایا گیا ہے

ذاتی حالت

۱۔ اس فصل کے لکھنے میں خاص طور پر ان کتابوں سے مدد لی گئی ہے :-

(۱) "پرسٹ ایشیا" (۲) "مینول آف برہزم" (از کرن) (۳) ارلی ہسٹری آف ایشیا

(۴) "برہما" اور "برہزم" جلد چہارم انسائیکلو پیڈیا طبع نو

جس کے دو بیویاں تھیں اور اولاد نہ ہوتی تھی۔ آخر عمر کے پینتالیسویں برس اس کی بڑی بیوی مہاتایا کو حمل رہا اور وہ اپنے میکے روانہ ہو گئی کہ وضع حمل تک وہیں رہے۔ لیکن میکے پہنچنے سے پہلے راتے میں وضع حمل ہوا اور آئندہ بوددہ نے سب سے پہلے سورج کی روشنی لمبہنی کے باغ میں دیکھی جو ریاست نیپال کی موجودہ حدود کے اندر شاید تلار ندی کے کنارے واقع تھا۔ یہ باغ جس شہر سے تعلق رکھتا تھا اس کے کھنڈر بھی حال میں دریافت ہوئے ہیں اور یہیں سے اشوک راجہ کا وہ مشہور کتبہ برآمد ہوا ہے جس سے گوتم بوددہ کی ولادت کا ٹھیک ٹھیک مقام معلوم ہوا ہے لیکن افسوس ہے کہ اس کتبے سے بھی سن ولادت کا تعین نہیں ہوتا۔ لٹکا کی مذہبی کتابوں سے اس قدر تو سراغ ملتا ہے کہ گوتم اشوک راجہ کی تخت نشینی سے دو سو اٹھارہ برس پہلے پیدا ہوا تھا۔ لیکن خود اس تخت نشینی کا سن یقینی طور پر معلوم نہیں ہے۔ کیونکہ مذکورہ بالا ماخذ کی رو سے اشوک ۳۵۰ ق م میں تخت پر بیٹھا۔ حالانکہ یورپ کے جدید محقق اس کو ۳۵۰ یا ۳۵۵ ق م کا واقعہ سمجھتے ہیں اور اسی بنا پر ان کے نزدیک گوتم کی پیدائش ۶۷۰ ق م میں ہوئی۔ چونکہ اس کی عمر کے متعلق یہ امر عام طور پر مسلم ہے کہ وہ اسی سال تک زندہ رہا۔ لہذا مذکورہ بالا سن ولادت کو درست مان لیا جائے تو اس کی وفات ۳۵۰ ق م کا واقعہ ہوگی اور متعدد قرآن سے

یہی دونوں سن قریب قریب صحیح ثابت ہوئے ہیں پُر
 بہر حال، اس قدر یقینی ہے کہ اپنی نوجوانی امیرانہ عیش
 و نشاط میں صرف کرنے کے بعد انتیس برس کی عمر میں اُس نے
 ترک دنیا کا ارادہ کیا اور عین اُس روز جب کہ اس کے
 ہاں بچہ پیدا ہونے کی خوشی میں رقص و سرود کے جلسے
 ہو رہے تھے رات کے وقت گھر سے نکل گیا۔ دنیا کی ثروت
 و جاہ کولات ماری اور جنگل میں ایک فاتح کش فقیر کی طرح رہنے
 لگا۔ اس حال میں اس نے شدید مصائب برداشت کئے اور
 عرصے تک سخت ریاضتیں کرتا رہا لیکن وہ اطمینانِ نفس جس کی
 خاطر یہ سب دکھ جھیلے تھے، میسر نہ آیا۔ آخر ایک روز جب کہ
 وہ نرن جبراندی کے کنارے ایک بڑے کے سائے میں بیٹھا ہوا
 یہی سوچ بچار کر رہا تھا اور مختلف خیالات کی کشمکش سو ہاں
 روح ہوی جاتی تھی، ناگہاں اسے اپنے خیال میں عرفانِ حقیقی
 کی تجلی نظر آگئی اور کئی دن کے بعد جب وہ اس درخت سے
 اٹھا تو عارفِ کامل (بڑھا یا بودھ) بن کے اٹھا اور دنیا کو وہ
 تعلیمِ دینی شروع کی جو ”بودھ مت“ کے نام سے مشہور ہے پُر
 بودھ نے اپنے مذہب کی غایت یہ رکھی ہے کہ انسان اسی
 دنیا کی زندگی میں ”نروان“ کو حاصل کر لے اور فروانِ نفس
 کی اس حالتِ مُطہرینہ کا نام ہے جس میں دُنیوی افکار و آلام کا

ترک دنیا

غایت اور
اصول
مذہب

علم ہندوؤں کے ہاں ”جیون مکتی“ (یعنی نجاتِ روح) اس لفظ کا مرادف ہے پُر
 دیکھو کرن کی کتاب صفحہ ۵۰ وغیرہ ۱۲

دل پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ یہی وہ شے ہے جسے حاصل کرنے کے بعد آدمی بودھ مت کی اصطلاح میں ”ارہٹ“ کے مرتبے پر فائز ہوتا ہے۔ یعنی اب وہ اخلاقی برائیوں کے جڑنیم سے پاک ہے، اس کی ناپائیاں دُھل گئیں، اس نے اپنا کام پورا کر لیا، اپنا بوجھ اتار دیا، بند بندا کر دئے اور آواگون کے چکر سے نجات حاصل کر لی!

اس ”رغائت“ کو پڑھ کر یہ سمجھنا دشوار نہ ہوگا کہ بودھ نے جس ”حقیقت“ کی بنیاد پر اپنی عظیم الشان عمارت چینی، وہ یہہ عقیدہ تھا کہ ”طبعاً انسان رنج و مصائب کا ہدف ہے“ جس وقت وہ ایک علیحدہ فرد بنا، اسی وقت سے وہ ایک ”محدود ہستی“ ہو گیا اور اس کے محدود ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس کا علم محدود اور ”جہل“ کا سبب ہو۔ جہل رنج و الم کا اصلی مبداء ہے لہذا (محدود ہستی کی شکل میں) انسان کی ”سکون“ ہی اس کے مصائب کی بنا ہے اور ان سے نجات صرف اسی صورت میں مل سکتی ہے جب کہ انسان ”طریقِ وسطیٰ“ یعنی نیچے کے راستے پر چل کر حقیقی عرفان حاصل کر لے۔

نیچے کا راستہ

گوتم کی تعلیم کے بہ موجب ”بیچ کا راستہ“ اختیار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان خیالات و خواہش، گفتار و کردار، کوشش و بسر اوقات اور ہوش و محویت، گویا آٹھ حالتوں میں، راستی کا پابند ہو۔ ان میں سے ہر حالت کے متعلق بودھ مت کی کتابوں میں صراحت و بحث کی گئی ہے اور بالکل شروع ہی میں (یعنی

خیالاتِ راست کی تصریح کے ضمن میں (روح کے علیحدہ وجود سے انکار کیا ہے۔ اور آواگون کی بھی بالکل دوسری صورت بیان کی ہے۔ یعنی ایک جسم سے دوسرے جسم میں کوئی ”روح“ منتقل نہیں ہوتی بلکہ ایک جنم کی بُری یا بھلی صفات اور افعال کا اثر منتقل ہو جاتا ہے اور دوسرے جنم میں انسان اپنے پہلے جنم کے کرم کا پھل پاتا ہے؟ گویا سیج پوچھئے تو ہندوؤں کے کرم کا مسئلہ گوتم نے ”دوتناسخِ صفات“ کی صورت میں تسلیم کر لیا تھا۔ اور اس نے روح کو جسم سے علیحدہ کوئی وجود یا ہستی نہیں مانا تو اس کی بڑی وجہ یہ قرار دی جا سکتی ہے کہ روح کے متعلق قدیم ہندوؤں میں بہت انوکھے اور عجیب عجیب عقائد پیدا ہو گئے تھے۔ بایں ہمہ خود بودھ مت کا ”تناسخ“ بھی کسی ایسی عقلی دلیل پر مبنی نہیں ہے جسے بلا وقت تسلیم کر لیا جائے۔

اسی سلسلے میں جب روح کے علیحدہ وجود سے گوتم نے انکار کیا تو اس روحِ اعلیٰ کو بھی اس کے مذہب میں کوئی ممتاز جگہ نہ ملی جس تک ہندو رشیوں کی فکرِ حکیمانہ (غالباً گوتم کے عہد سے بہت پہلے) پہنچ چکی تھی۔ حالانکہ اس مذہب میں بہت سے دیوتاؤں کو مانا گیا ہے جن کے مختلف عالم اور طبقے قرار دئے ہیں۔ اور خود بائنی مذہب کو جن قواء سے متصف مانا ہے۔

خدا سے
بے تعلق؟

مذہب اس بارے میں کہ بودھ مت نے خود کبھی منقولی مذہب ہونے کا دعویٰ نہیں کیا،

دیکھو کرن کی ”منشورل آف انڈین بھہزم“ صفحہ ۵۰۹-۵۱۰

وہ بھی اگر خدای نہیں تو مافوق الانسان ضرور ہیں۔ بہر حال بودھ مت کی یہی وہ عجیب خصوصیت ہے جس کی بنا پر بعض مغربی مصنف گوتم کو دنیا کا سب سے ”بلند خیال“ فلسفی ماننے کے لئے تیار ہیں۔ گوتم اس کی تعلیم بجنسہ اب موجود نہ ہو اور اس لئے حقیقی معنی میں بودھ مت کے پیرو مفقود ہو چکے اور گوتم عقل، اس کے بتائے ہوئے عقائد کو نہ مانے اور تجربہ، اس کی ”شریعت“ کو ناقابل عمل ٹھیرائے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گوتم کے تخیل نے مذہب و اخلاق کی جو حیرت انگیز عمارت تیار کی تھی وہ دنیا کے کسی دوسرے فلسفی سے کبھی نہ بن سکی اور یہی سبب ہے کہ آج اگر افلاطون و سہراکلی تیس کے صرف تحریری مسائل مدرسوں میں پڑھے جاتے ہیں تو گوتم کی مورت صد ہا مندروں میں عبادت کا خراج وصول کرتی ہے۔ ان بھولے پرستاروں کو عقل و ذہانت میں ہم ان طلبہ کا ہم پلہ نہ تسلیم کریں تو بھی یہ ماننا پڑیگا کہ دنیا کے دیگر حکما، بنی نوع کو محض اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرتے رہے اور ہندوستان کے اس مٹی نے ہزاروں کو

۱۔ بودھ مت ماننے والے سب سے بڑی تعداد میں چینی کے باشندے سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن اعمال و عقائد میں ان کا یہ مذہب دوسرے ادیان خاص کر تائو کے ساتھ اس قدر خلط ملط ہو گیا ہے کہ انہیں گوتم کا پیرو کہنا درست نہ ہوگا۔ ملاحظہ ہو انسانی کلوچرٹیا جلد ۶ صفحہ ۱۰۵۔

علماً اپنا پیرو بنا دیا۔
 اہل مشرق کی اوہام پرستی کو بھی اس کامیابی کی ایک
 وجہ قرار دے سکتے ہیں۔ لیکن محض اس توجیہ پر اکتفا
 کرنا، گوتم کے فلسفے کی جس نے ہندوستان کے قدیم تر
 مذاہب کا رنگ پھیکا کر دیا، سخت ناقدری ہوگی۔ دوسرے
 اس عہد کے حالات کو سامنے رکھنے سے یہ بات بخوبی سمجھ
 میں آجاتی ہے کہ گوتم کی کامیابی کے اصلی اسباب کیا تھے؟
 درحقیقت وہ قدیم عقائد میں اصلاح کرنے کا اس قدر خواہاں نہ تھا
 جس قدر کہ علیٰ طور پر اپنے بنی نوع کی زندگی سنوارنی چاہتا تھا
 اور اس میں اور دیگر فلاسفہ میں یہی فرق ہے۔ اگر اس نے
 ”آتماں“ سے انکار کیا یا ”پراتماں“ سے کوئی سروکار نہ رکھا
 تو اس کا باعث بھی یہ تھا کہ وہ اسی دنیاوی زندگی اور جسمانی
 افعال کی اہمیت پر زور دینا چاہتا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ
 انسان فیطرۃً بری کی طرف مائل پیدا ہوا ہے اور بدی اس کے
 تمام آلام و مصائب کی جڑ ہے پس محض اپنی دنیاوی زندگی
 آرام و راحت سے گزارنے کے لئے انسان کا فرض ہے کہ
 بدی سے بچے۔ اس بدی کی اُس نے ایسے شکلیں گسائی
 ہیں جن میں سے دس کو وہ ”سمبوجن“ (یعنی بندشیں) کہتا
 ہے، چار کو ”اشوا“ (یعنی نشے) اور پانچ کا اصطلاحی نام
 ”نیورن“ (یعنی موانع) بتاتا ہے۔ ان سے بچنے اور آٹھ
 سچائیوں پر چلنے کے لئے جن کا اوپر ذکر آچکا ہے، سالک کو

کم سے کم چالیس ”کم ٹھکان“ (یعنی اعمال) کی پابندی کرنی چاہئے جن میں چند قسم کے مراقبے اور درویشانہ قسم کی زندگی گزارنے کی تعلیم ہے۔ ریاضت ہائے شاقہ اور ترک دنیا سے بودھ نے اپنے پیروں کو بہ تاکید روکا ہے لیکن ترکیب نفس کے لئے جو گیوں کے بعض طریقے اور مراقبے اختیار کر لئے ہیں، جو پہلے سے ہندوستان میں موجود تھے، ان مراقبوں میں خدا سے تو نہیں لگائی جاتی بلکہ سفیدی، زردی، روشنی یا آب و خاک وغیرہ عناصر پر دھیان جماتے ہیں ان اعمال سے آدمی کو بافوق الانسان قوت حاصل ہو جاتی ہے اور اگر سب مقامات طے کر جائے تو بودھ کا دعویٰ ہے کہ پھر سالک تمام برائیوں سے پاک ہو کر ”نفس مطہتہ“ حاصل کر لیگا جس کے بعد صرف ایک درجہ ”فنا“ کا اور ہے اور اس کی تکمیل موت کے بعد ہوتی ہے۔

ملکہ کرن صفحات ۳۵ و ۳۶-۱۲

ان عبادات کو دیکھ کر قدرتی طور پر تعجب ہوتا ہے کہ ذات باری تعالیٰ کے متعلق بودھ کا وسیع نظام مذہبی کیوں ساکت ہے؟ گمان ہوتا ہے کہ شاید اس نے اس تعلیم کو محض انکشافی اور وجدانی قرار دیا ہو اور واجب الوجود کو منطقی اور علمی دلائل سے ثابت کرنے کی بجائے مراقبہ کی غایت ہی یہ رکھی ہو کہ سالک اپنی ذات کو فنا کر کے اُس ذات واحد کا ادراک کرے جو نہ جو اس ظاہری سے محسوس ہو سکتی ہے نہ ظاہری علم اور عقل و قیاس کی اس تک رسائی ہے۔ مگر مذکورہ بالا رائے کا کوئی ثبوت زمانہ جدید کے محققین کی تحریر میں نہیں ملتا اور بعض مغربی مصنف اس بات پر زور دیتے ہیں کہ گوتم بودھ کی شریعت اور طریقت میں وجود باری تعالیٰ کا کہیں ذکر نہیں ہے، حالانکہ انہیں اس بات کا اقرار ہے کہ بودھ کی تعلیم میں بہت کچھ تعریف ہو چکی ہے اور اب اُس کی اصلیت کا ٹھیک ٹھیک پتہ نہیں چل سکا، اسی ضمن میں یہ کہنا ضروری ہے کہ ہمارے لایق ہوطن بابو منہا تہ دت نے اپنی مشہور کتاب ”پرافٹس آف انڈیا“ (حصہ اول) میں بودھ کے لحد ہونے کی شد و مد سے تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ وہ کرشن جی کی طرح پتلا ٹوٹا تھا۔

باب چہارم

پہلی فصل اسکندر کی فوج کشی ہندوستان پر

ہندوستان کی قدیم تاریخ کے جو ورق سادہ پڑے ہیں انہیں مذہبی مباحث سے پر کرنے کا خیال اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ اس بارے میں ہمارے پاس کچھ نہ کچھ وسائل معلومات موجود ہیں خاص کر بودھ مت نے پجاریوں کے علی الرغم جو فروغ چھٹی اور پانچویں صدی (ق م) میں حاصل کیا، اس کے بہت سے حالات روایات و قصص کی صورت میں باقی رہ گئے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ واقعات تاریخی کے جو یا کی مذہب و فلسفہ کے پیچیدہ مسائل پڑھ کر تشفی نہیں ہو سکتی۔ پس مؤرخوں کی نظر میں سکندر یونانی کی آمد، گویا رات کی تاریکی میں کسی شمع کا روشن ہو جانا ہے جس کے اُجانے میں ہمیں نہ صرف مردانِ مقدونیہ اور شہسوارانِ تھسالیہ کی سپاہ گری، بلکہ ہندوستان کے بہت سے باشندوں کی صورتیں نظر آئیں گی۔

اس مغربی کشور کشا کی حملہ آوری کا سبب بیان کرنے میں مغرب کے موجودہ اہل تصنیف نے بڑی بڑی موٹگافیاں کی ہیں۔ کوی تو لکھتا ہے کہ وہ یونان (اور اس لئے یورپ) کی تہذیب کا شمع بردار بن کر چلا تھا اور تمام ایشیا میں اس تمدن کی روشنی

طے کا سبب

پھیلا دینی چاہتا تھا کسی نے ثابت کیا ہے کہ سکندر کی ہند پر فوج کشی تجارتی اغراض پر مبنی تھی اور وہ اس ملک کا جسے اہل یونان عجائبات کی سرزمین اور دولت کی کان سمجھتے تھے راستہ صاف کر دینے کا خواہاں تھا۔ لیکن وہ لوگ جو قلب انسانی کے چور پکڑ لیتے ہیں اور جنہوں نے بادشاہوں کے خوفناک جذباتِ باطنی کا مطالعہ کیا ہے، ان باتوں کو محض مورخانہ وکالت سمجھیں گے۔ یہ عذر تو کسی حد تک قابلِ سماعت ہو سکتا ہے کہ دولتِ ایران کا نیا وارث داریوش کے قدیم صوبے کو پھر سلطنت میں شامل کرنے کا خواہاں تھا۔ ورنہ سچ پوچھئے تو اُس گرفتار ڈاکو کے الزامی سوال کا سکندر کے پاس کوئی شافی جواب نہ نکلے گا، جس نے پہلے اپنا جرم دریافت کیا تھا اور پھر جواب میں کہا تھا کہ اگر دوسروں کا مال چھین لینا جرم ہے تو اے بادشاہ (سکندر) تو دوسروں کے ملک کیوں چھینتا پھرتا ہے؟ یہ روایت سچ ہو یا جھوٹ، شاید اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ سکندر کی فتوحات کے متعلق راوی کی رائے کیا تھی!

درحقیقت دولت و جاہ کی طرح ملک گیری کی ہوس بھی کسی دلیل عقلی کی پابند نہیں۔ بلکہ جس طرح روپیہ کی زیادتی کے ساتھ طامع بخیل کی محبتِ مال بڑھتی ہے اسی طرح نئے مقبوضات سے فاتح بادشاہ (یا قوم) کی ہوسِ ملک ستانی بھی افزوں ہوتی جاتی ہے۔ اور ایک زمین پر قبضہ کرتے ہی وہ دوسرے علاقہ لینے کی اوجھڑپ میں لگ جاتا ہے۔ نفسِ انسانی کے اس مرض کا انجام عام طور پر

ہلاکت ہوا ہے۔ جس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ جیتے جی اس عارضے سے شفا حاصل ہونی دشوار ہے۔ اور تاریخ گواہی دیتی ہے کہ جنھوں نے کشور کشتائی کے میدان میں قدم رکھا، خواہ ان کی غرض محض حصول شہرت و نام آوری ہو یا اپنے ہم قوموں کی نفع رسانی، وہ پھر اس وقت تک کہ حریفان قوی یا مرگ مہم نے انہیں مغلوب نہ کیا، آگے بڑھنے سے نہیں رُکے؛ سکندر یونانی کو بھی اس عہد کی سب سے وسیع سلطنت مسخر کرنے کے بعد اگر تمام عالم کی بادشاہی کی اور پشیمو حیوان، یا سورج کے دروازے“ دیکھنے کی ہوس پیدا ہو گئی ہو تو یہ کچھ حیرت کی بات نہیں ہے۔

بہر حال، یونانی فاتح کا لشکر مسند و باختر کی تسخیر سے فراغت پا کر موجودہ افغانستان کے علاقہ میں داخل ہوا (۳۲۷ ق م) اور وہاں سے دو حصوں میں منقسم ہو کر کوہستان سلیمان کو عبور کر آیا؛ ان فوجوں نے جو راستے اختیار کئے تھے، ان کا پتہ چلانا دشوار ہے کیونکہ اول تو اس زمانے کی بستیاں ہی ویران و غیر آباد ہو گئیں دوسرے یونانی مصنفوں نے ان کے صحیح نام یا محل وقوع نہیں لکھے؛ اس قدر ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جو فوج خود سکندر کے ماتحت تھی وہ چترال ندی کی وادی سے گزر کر سب سے اول

آمدگار راستہ

۱۔ سکندر کی ان اولوالعزمیوں کے متعلق جو روایتیں مشہور تھیں اور اب تک مشہور ہیں وہ بالکل بے بنیاد تھیں۔ ملاحظہ ہو ”اکزٹنڈرز ایمپائر“ صفحہ ۳۵

سرحد ہندوستان کے اس علاقے میں داخل ہوئی تھی جسے آج کل باجور کہتے ہیں۔ یہاں کے باشندوں سے دو سخت لڑائیاں ہوئیں، یونانیوں کو غلبہ حاصل ہوا اور وہ موجودہ سوات کی ایک پہاڑی ریاست نیسا میں پہنچے جس کی تسخیر کے حالات مشتبہ ہیں۔ یونانی راولوں کا بیان ہے کہ یہاں کے پائے تخت پر فوج کا حملہ کارگر نہیں ہوا تو سکندر نے شہر کی ناک بندی کا سامان کیا۔ لیکن خود شہر والوں نے اطاعت قبول کر لی اور یہ عجیب دعویٰ پیش کیا کہ ہم اہل مقدونیہ کے ہم نسل ہیں۔ سکندر نے یہ دعویٰ (جس کے ثبوت ذرا بھی قابل یقین نہ تھے) با حجت مان لیا اور ان صدیوں کے ”پچھڑے ہوئے عزیزوں“ کی مہمانی قبول کی، اس زمانے کے نقادوں کا خیال ہے کہ سکندر کا یہ فعل اس مصلحت پر مبنی تھا کہ مقدونی سپاہیوں کی، جنھیں وطن چھوڑے برسوں گزر گئے تھے، اشک شوی ہو جائے اور وہ اپنے ان فرضی رشتہ داروں میں چند روز آرام لے لیں، مگر اس کے علاوہ ایک یہ قیاس بھی ہو سکتا ہے کہ ان روایتوں میں یونانی مؤرخوں نے اپنے مدوح کی ناکامی چھپائی ہے اور یہ وہ فن ہے جس میں قدیم اہل یونان ہی گویا یورپ والوں کے استاد ہیں۔

اس قیاس کی بالواسطہ تصدیق شاید ان روایات سے بخوبی ہو سکتی ہے جو کہ فتح مساکا کے متعلق یونانیوں نے بیان کی ہیں۔ اس بات کا ٹھیک ٹھیک پتہ نہیں چلتا کہ یہ مستحکم اور مرکزی شہر کہاں واقع تھا لیکن سکندر کا اسے ہتھ کر کے چھین لینا وہاں کے

مقتول رئیس کی بیوہ سے شادی کرنا اور پھر اُن سات ہزار اجیر سپاہیوں کو ایک بہ یک حملہ کر کے قتل کرا دینا جو یونانیوں کے ساتھ ہو کر لڑنے کا وعدہ کر چکے تھے اور پھر قلعے سے باہر آنے کے بعد بغیر وعدہ پورا کئے نکل جانا چاہتے تھے، ایسی روایتیں ہیں جن پر کسی طرح اعتبار نہیں آتا، اور بعض ہم عصر اہل مغرب کی تصانیف پڑھ کر خیال گزرتا ہے کہ انہوں نے بھی اہل ہند کے مقابلے میں ایک فرنگی بادشاہ کی بیجا پاسداری کی تھی؛ سکندر کی بد عہدی کا خود یونانی راویوں نے دبی زبان سے ذکر کیا ہے لیکن تاریخی تنقید کے جدید اصول کی رو سے ان کی طرف روایتوں کو پڑھ کر اس نتیجے پر پہنچنا دشوار نہ ہوگا کہ فتح مساکا میں یونانیوں کی بہادری سے زیادہ اُن کے کمر و فریب اور ہندی وطن فروشوں کی غداری کو دخل تھا۔ پہلے ہی سکندر کے لشکر میں ہندوستان کے کئی رئیس و راجہ موجود تھے جنہوں نے محض باہمی نفاق اور ہمسائیوں کی رقابت میں حملہ آوروں کا ساتھ دیا تھا اور کابل کے علاقے سے ان کے ہمراہ تھے۔ بلکہ کچھ تعجب نہیں کہ انہی کی مدد کے بھروسے پر اس مقدونی کشور کشا نے ہندوستان میں بڑھنے اور اپنا شوق کشور ستانی پورا کرنے کی جرات کی ہوئی۔

۱۔ اس کی سب سے اچھی مثال غالباً وہ ”رائے زنی“ ہے جو اس واقعہ پر وینٹ آسٹم نے کی ہے۔ دیکھو الٹی ہسٹری آف انڈیا صفحہ ۵۶۔

دوسری فصل - جنگ پورس (۳۲۶ ق م)

بہر حال اب سکندر ہندوستان کے قدرتی کوہی مورچوں کو طے کرنے کے بعد میدانی علاقے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی فوج کا ایک دستہ پہلے سے دریائے سندھ پر پہنچ گیا تھا اور ٹکسیلا کے راجہ کی مدد سے اُس مقام پر کشتیوں کا ٹیل تیار کر رہا تھا جو آج کل اوہند کہلاتا ہے۔ اسی جگہ راجہ (آمبھی) نے سکندر کا خیر مقدم کیا اور فروری یا مارچ ۳۲۶ ق م میں یورپ کا پہلا بادشاہ سندھ اتر کے پنجاب کے علاقے میں داخل ہو گیا۔

سکندر کے ہندی حلیف یعنی آمبھی کا پائے تخت ٹکسیلا دریا سے بین پچیس میل آگے موجودہ راولپنڈی کے شمال مشرق میں واقع اور اُس زمانے میں ہندوستان کے سب سے بڑے شہروں میں شمار ہوتا تھا۔ ہندوؤں کے قدیم علوم خاص کر ہندی طب کی تسلیم کا جو اہتمام اس شہر میں کیا گیا تھا، وہ شمالی ہند میں کہیں نہ ہوگا۔ چنانچہ وہاں کے مشہور مدرسے میں تعلیم پانے کے لئے دُور دُور کے طلبہ آتے تھے اور صاحبانِ علم کی بڑی قدر تھی۔ دولت و حشم کے اعتبار سے بھی یہاں کا راجہ اپنے مشرقی حریف (پورس) سے کچھ بہت کم نہ تھا اور اس نے کئی ہفتے تک شاہانہ کروفر کے ساتھ یونانی سپاہ کی مہمانی کی۔

اسی غرض سے تین ہزار گائیں یا بچھڑے بھی بال کر تیار کئے گئے تھے کہ یونانیوں کی

یونانی راوی لکھتے ہیں کہ اس نے کمال مجز کے ساتھ اپنا ملک و مال سکندر کے حوالے کر دیا تھا اور سکندر نے اُسے اس کی ریاست بخش دی اور اپنا باج گزار والی تسلیم کر لیا۔ افسوس یہ ہے کہ اس بارے میں خود اہل ہند کی کوئی تحریر ہمارے پاس نہیں ہے جس کی بنا پر یونانی روایات کی تصدیق یا تردید کی جا سکے۔ لیکن یہ بالکل یقینی بات ہے کہ یونانی مصنفوں نے اپنی شوکت منائی کا پہلو ہمیشہ مد نظر رکھا اور تاریخی واقعات کے بیان کرنے میں رنگ آمیزی کی ہے۔ اسی لئے اگر ہم یہ کہیں کہ مگھیلہ کے راجہ نے اپنے ہمسائوں کے خلاف سکندر سے مدد چاہی اور جب وہ آیا تو اپنی سیاسی مصلحتوں سے یونانی فوج کی بہت کچھ خاطر مدارات کی اور حلیف بن کر اپنے حریف راجہ پورس کو تباہ کرا دیا، تو گو اس قول کی کوئی منقولی شہادت بیستر نہ آئے تاہم بعض قرائن اور آئندہ واقعات سے اس کو تقویت ہوتی ہے مگر ان قیاسات پر غور کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم یونانی روایات کے مطابق ان تمام واقعات پر ایک نظر ڈال جائیں جو سکندر کی ہند سے واپسی تک

ضیافت میں کام آئیں۔ اور اس واقعے سے ظاہر ہے کہ سکندر کی آمد تک ہندوستان کے اکثر حصوں میں گاوہ کشی اسی طرح جائز تھی جس طرح ”زادہ وہ“ میں (اوکسورڈ ہسٹری۔ صفحہ ۵۹ و ۶۱) اسی ضمن میں یہ لکھنا خالی از لہجہ نہیں ہوگا کہ متبرہ یونانی مصنفین کی روایت سے مگھیلہ میں تسمہ ازدواج اور ستی کی رسم کا ہونا بھی ثابت ہے مردوں کو کھلی جگہ میں ڈال دینا کہ گیدہ کھا جائیں، آگ کی پوجا یا اور بعض رسموں سے پتہ چلتا ہے کہ ان دنوں ایرانی مذہب کے بعض عقائد بھی ہند کے مذہب و تمدن میں ذیل تھے جو

اسے پیش آئے تو

جہلم پورس کے
کوشش

مکھیلا کے مقام سے ریاست بیج کے راجہ کو پیام بھیج دیا گیا تھا کہ سکندر کی اطاعت قبول کرے اور پیشوائی کے لئے اپنی سوجھ بوجھ پر حاضر ہوئے ریاست بیج کا نام اپنی آسانی کے لئے ہم نے اختیار کر لیا ہے۔ معلوم نہیں قدیم زمانے میں اس ریاست کا علموہ نام کیا تھا، جس کے متعلق صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ اس میں دیائے جہلم اور چناب کے دو آبے کا علاقہ اور تین سو بستیاں شامل تھیں۔ اس دو آبے کو آج کل جہلم اور چناب کا نام ایک لفظ میں مخفف کر کے بیج یا چنبا کہنے لگے ہیں اور وہ شاہپور، گجرات اور جہلم کے اضلاع پر مشتمل ہے قدیم اور تاریخی ناموں کے متعلق ہماری کوتاہی معلومات کا یہ حال ہے کہ خود ”پورس“ کا ہندی اور اصلی نام آج تک معلوم نہ ہوا۔ سکندر کے اس نامی حریف کو یونانیوں نے یہ نام دیا ہے اور مسلمانوں کی تصانیف میں اسے ”فورہندی“ کہا گیا ہے جو پورس ہی کا معرب ہے۔ ہندوستان کی کسی پرانی کتاب میں اس کا ذکر نہیں ملتا اور اس لئے یہ محض قیاس ہی قیاس ہے کہ اس کا اصلی نام پورو ہوگا تو بہر حال، راجہ نے سکندر کو جواب میں کہلا بھیجا کہ اس کا

عربی غالباً خود اسلامی مصنفین کی تحقیقات کو اس میں دخل نہیں اور معلوم ہوتا ہے ان میں یہ نام یونانیوں کے ہاں سے آیا تو ۱۲

خوشی سے استقبال کیا جائے گا۔ مگر ایسا جیسا کہ مردانِ جنگ کیا کرتے ہیں، پھر اپنی فوج آراستہ کی اور جہلم کے کنارے تک بڑھ آیا کہ یونانیوں کو دریا پار کرنے دے تو یہ سخت گریبوں کا زمانہ تھا اور پہاڑوں کی برف گھلنے سے جہلم چڑھا ہوا تھا۔ ایک قوی دشمن کے مقابلے میں یونانی سپاہ دریا کو کسی طرح عبور نہ کر سکتی تھی لہذا موترخ ابرہین کے لفظوں میں سکندر نے ”راستہ چرانے“ کی کوشش کی، یعنی چھپ کر پار ہونا چاہا اور ظاہر تو یہ اعلان کر دیا کہ جہلم کو (پانی اترنے کے بعد) موسمِ سرما میں عبور کیا جائے گا لیکن خفیہ طور پر اپنے مقام سے سولہ سترہ میل شمال میں بہت سے تختے اور کشتیاں جمع کر دیں اور ایک رات جب کہ سیاہ بادلوں نے اور بھی اندھیرا کر رکھا تھا وہ فوج کا چیدہ دستہ چکر دے کے اس طرح دریا کے پار اُتار لایا کہ راجہ کے سپاہی خبردار نہ ہونے پائے اور صبح ہوتے پورس کو غنیم کے آنے کی اطلاع ہوئی بھی تو اُس نے حملہ آوروں کی تعداد کا غالباً اتنا غلط اندازہ کیا تھا کہ اول اول کچھ جنگی رتھیں اور صرف دو ہزار سوار مقابلے کے واسطے بھیجے۔ جب یہ شکست کھا کے پسا ہوئے اور شاید یہ معلوم ہوا کہ خود سکندر آگیا ہے، تو اس وقت پورس اپنی پوری فوج لے کے میدان میں آیا تو

جگہ جسے گری کا میدان کہتے ہیں، موجودہ کشمیر کی سہری پہاڑیوں کے دامن میں واقع ہے۔ جہلم انگریزی علاقے میں

داخل ہوتے ہی جہاں خم کھا کے تھوڑی دور تک بہت چوڑا ہو گیا ہے اس کے شمال مشرق میں ایک ہموار پٹی (یعنی جہی ہوی ریتی) قوس نما پہاڑیوں کی آغوش میں آجاتا ہے۔ جس کا طول دس بارہ میل اور بڑے سے بڑا عرض ۵ میل کے قریب ہوگا لیکن جنوب میں تنگ ہوتے ہوتے وہ دو میل سے بھی کم رہ گیا ہے اور نقشہ جنگ کو دیکھتے ہی خیال گزرتا ہے کہ سکندر نے حریف کو اس جگہ کیوں نہ روکا کہ ہندی لشکر اپنی کثرت تعداد سے فائدہ نہ اٹھا سکتا۔ کیونکہ پورس کے آتے آتے غالباً اسے اتنی مہلت مل گئی تھی کہ طوفان میں بھیکے ہوئے سپاہی اپنے کپڑے سکھا کر وہاں تک بڑھ سکتے تھے جس راستے سے پورس کی فوج میدان میں داخل ہو رہی تھی۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ گو ہندی پیادوں کی تعداد یونانیوں سے ڈھائی گنی (یعنی تیس ہزار) بتائی گئی ہے اور جنگی رتھوں، عیب ہاتھیوں اور کثرت ساز و اسلحہ کے بیان میں یونانی مصنفوں نے اپنی انشا پر دازی کا زور صرف کر دیا ہے، بایں ہمہ چار ہزار ہندی سواروں کے مقابلے میں یونانی سواروں کی تعداد پانچ ہزار تھی اور یہی وہ فرق ہے جس نے جنگ کا فیصلہ کر دیا کیونکہ گو پورس میدان کے وسط یعنی سب سے عریض حصے تک بڑھ آیا تھا اور اُسے سف بندی کی بھی مہلت مل گئی تھی

لیکن دونوں بازو جن پر جنگی رتھیں اور سواروں کا رسالہ تھا، کمزور تھے اور یونانیوں سے پہلا تصادم اپنی کا ہوا۔ یعنی اول سکندر کے سوار تیر برساتے ہوئے ہندیوں کے بائیں پہلو پر آگرے اور جب ان کی مدد کے لئے ہندی میمنے کے سوار بڑھے اور صفوں میں انتشار پیدا ہوا، تو یونانی رسالے نے دائیں پہلو پر حملہ کیا اور اس طرح ہندی سوار دونوں طرف سے پسپا ہو کر قلب لشکر کی طرف بھاگے جہاں ہاتھیوں کے پیچھے پیادوں کی فوج کثیر صرف بستہ تھی۔ کہتے ہیں ان جنگی ہاتھیوں پر پورس کو بہت ناز تھا اور اس میں شک نہیں کہ جب یونانی قلب کے پیادے سامنے پہنچے تو ہاتھیوں کے پہلے ریلے نے ان میں تہلکہ ڈال دیا۔ لیکن سچ پوچھئے تو یہ عارضی کامیابی بھی آئندہ ناکامی کی دلیل تھی اور اس کے معنی یہ تھے کہ ہندی پیادوں کو میدان جنگ میں خاطر خواہ حصہ لینے کی نوبت ہی نہ آئے۔ اس کے علاوہ بازوؤں پر

سطح ” پورس کو اپنے ہاتھیوں پر بھروسہ تھا۔ مگر جنگ کے وقت وہ پوری طرح کام نہ دے سکے اور بعد میں بے قابو ہو کر انہوں نے دشمنوں کی نسبت دوستوں کو زیادہ نقصان پہنچایا۔ رتھوں کے تیراواز سکندر کے سوار کمان برداروں کی مگر کے نہ تھے۔ ادھر میدان کی پھسنی زمیں نے ہندی پیادوں کو اپنی زبردست کمان سے کام نہ لینے دیا کیونکہ انہیں کمان کا ایک ہلکے ترین پر ٹیک کر بائیں پاؤں سے روکنے اور ہاتھ سے کھینچ کے تیر چلانے کی عادت تھی۔ ہندی پیادوں کے بائیں شانے پر بہت بھاری دو دستی تلوار اور جرم گاڑ کی بے منڈھی ڈھال تھی (اور اسے سنبھالنا دشواری سے خالی نہ تھا) اور بعض سپہی کمانوں کی بجائے سانگ سے مسلح تھے،“ (اکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۶۴)

جو غلبہ سکندر کو حاصل ہو چکا تھا، اس میں ہاتھیوں کے وسطی حملے سے چنداں فرق نہ آیا اور ہندی سواروں کے منتشر ہوتے ہی دشمن کی پیادہ فوج کے دونوں پہلو سواران یونان کی زد میں آگئے۔ اور یہ وہ خطرہ تھا جس کی پورس کوئی روک تھام نہ کر سکا۔ اُس کے جنگی ہاتھی زخم کھا کے بیقرار اور جہاتوں کے قابو سے باہر ہو گئے تھے اور جدھر منہ اٹھتا، بھاگتے اور بلا امتیاز دوست دشمن کو روندتے چلے جاتے تھے۔ ان کا اگر زور تھا بھی تو میدان کے وسط میں تھا جہاں یونانی پیادے انہیں بڑھتے دیکھ کر ادھر ادھر بھاگ جاتے اور ہر طرف سے نیزہ و تیر کی بوجھار کر دیتے تھے۔ حتیٰ کہ ہاتھی سخت زخمی ہو کر گرنے لگے اور بھاگتے بھاگتے شل ہو گئے۔ ان میں کوئی ترتیب نہ رہ سکی اور اہل مقدونیہ کی پیوستہ صفوں نے ہندی قلب پر پوری قوت سے حملہ کیا۔ اس قلب کے دونوں بازووں کو یونانی سواروں کے تیرم حملوں نے پہلے ہی پریشان کر رکھا تھا، جس وقت یونانی پیادے اپنی برجھیاں تول تول کے بڑھے، تو پھر ہندی لشکر دیر تک میدان میں نہ ٹھہر سکا اور ایسا بے حواس ہو کر بھاگا کہ ہزاروں آدمی مارے گئے اور جو میدان سے نکل گئے تھے ان پر کراتروس کے تازہ دم سپاہیوں نے حملہ کیا۔ یہ سردار پڑاؤ پر چھوڑ دیا گیا تھا کہ راجہ کو سکندر کے لشکر سے نکل جانے کی خبر نہ ہو اور اسے ہدایت کر دی گئی تھی کہ جب ہندی فوج دریا کے پار لڑائی میں الجھ جائے تو موقع دیکھ کر وہ بھی جہلم کو عبور کر آئے؛

فتح کی
یادگاریں

جنگ میں راجہ پورس بھی گرفتار ہو گیا تھا لیکن سکندر نے نہ صرف اس کی ریاست اور جان اسے بخشی بلکہ کچھ اور علاقہ اپنی طرف سے دے کے اُسے اپنا وفادار حلیف بنا لیا۔ پھر اس فتح کی یادگار میں دو شہروں کی بنیاد رکھی جن میں پہلا سکندر کے محبوب گھوڑے بوکفالوس کے نام پر بوکفالیہ کہلاتا تھا اور اس کے کھنڈر موجودہ قصبہ جہلم کے متصل دریافت ہوئے ہیں۔ دوسرا (نکایا) غالباً خاص میدان جنگ پر بسایا گیا تھا جس کا اب کوئی نشان باقی نہیں۔ فتح کی تیسری اور دلچسپ یادگار اس سکتے کو سمجھا جاتا ہے جس کے ایک طرف سکندر کی برق بدست تصویر بنائی ہے اور دوسری طرف ایک مقدونی سوار بھاگتے ہاتھی کا پیچھا کر رہا ہے۔ بعض اہل تحقیق خیال کرتے ہیں کہ یہ سکندری فتح کی یادگار میں تمنے کے طریق پر یونانی سپاہیوں کو تقسیم کیا گیا تھا۔

بیاں تک
پیش قدمی

پورس کی شکست کے بعد دُور تک کسی بڑے راجہ سے مقابلے کا خدشہ نہ تھا لہذا سکندر نے اپنے نئے باج گزار کے علاقے سے بہت جلد آگے کوچ کیا کیونکہ کہتے ہیں اُسے دریائے گنگا تک پہنچنے کا شوق تھا جسے قدیم یونانی دنیا کی مشرقی سرحد سمجھتے تھے۔ چناب و راوی کے عبور میں کوئی مزاحمت نہ پیش آئی۔ لیکن راوی کے مشرقی کنارے کے دیہات و

علا اس لڑائی کی صحیح تاریخ تو معلوم نہیں لیکن وہ جون کے آخر یا شروع جولائی (۳۲۵ء) میں واقع ہوئی تھی۔

قبائل نے اس کی اطاعت قبول نہ کی اور ایک مرکزی قلعے میں محصور ہو کر بہت دن تک مقابلہ کرتے رہے۔ یونانیوں کی مدد کے لئے راجہ پورس بھی پانچ ہزار سپاہی لے کے آیا اور آخر سخت کشت و خون کے بعد غالباً ماہ اگست میں یہ قلعہ سر ہو گیا اور سکندر نے آگے مشرق کی راہ لی۔ مگر اس کے سپاہی اس قدر بد دل سے کوچ کر رہے تھے کہ سکندر بھی اس بات کو سمجھ گیا اور اُس نے ان کے دل میں گرمی پیدا کرنے کی غرض سے دریائے بیاس کے کنارے پہنچ کر ایک پُر جوش تقریر کی۔ ان کے پچھلے کارنامے دہرائے، اور آئندہ فتوحات میں ناموری اور مال غنیمت کا لالچ دلایا۔ لیکن دیس کی یاد اور جسم کی تکان زبانی باتوں سے دفع نہ ہو سکتی تھی۔ اس کے مضحک رفیق آگے بڑھنے پر کسی طرح آمادہ نہ ہوئے فتح ایشیا کے اس ناکام آرزومند کو طوعاً و کرہاً فوج کی واپسی کا حکم دینا پڑا تو

تیسری فصل۔ سکندر کی مراجعت ہندوستان سے

واپسی میں سکندر نے کچھ روز جہلم کے کنارے کڑی کے میدان کے قریب قیام کیا۔ دریا کے دونوں طرف جو نئے شہر تعمیر کرائے تھے ان کے آباد اور محفوظ کرنے کے متعلق بعض ہدایتیں کیں۔ راجہ پورس اور آسمبھی کے علاوہ اور بھی کئی رئیسوں نے اس کی اطاعت قبول کر لی تھی، غالباً ان بے علاقوں کی حد بندی بھی اسی قیام کے زمانے میں کی گئی۔ دریائے سندھ کے مغرب میں سکندر نے اپنی ایک ولایت یا ست راپی پہلے بنا دی تھی اور

دریائی سفر

اس پر ایک یونانی سردار کو مقرر کر چکا تھا۔ لیکن سندھ اتر کے خاص ہندوستان کا کوئی حصہ اس نے براہ راست اپنے قبضے میں نہیں لیا بلکہ یونانی روایات کے یہ موجب سندھ سے جہلم تک آہمی کی اور جہلم سے بیاس تک پورس کی عملداری رہی اور ان دونوں نے سکندر کی بلج گزاری یا دوستی کا عہد کر لیا۔

اس اتنا میں ہر قسم کی چھوٹی بڑی کشتیاں فراہم کی جا رہی تھیں کہ ان میں فوج کا کچھ حصہ، ساز و سامان اور گھوڑے دریا کے راستے روانہ کئے جائیں۔ کشتیوں کی کل تعداد کم سے کم آٹھ سو اور زیادہ سے زیادہ دو ہزار بیان کی گئی ہے اور ان میں سب سے بڑے تیس چپو کے آٹھ جنگی جہاز تھے اور گویہ جہاز عرض و طول یا رفتار میں آج کل کے معمولی تجارتی جہازوں سے بھی کوئی مناسبت نہ رکھتے تھے، بایں ہمہ پنجاب کے دریاؤں میں اتنا بڑا بیڑا کبھی نظر نہ آیا ہوگا جسے خود سکندر ماہ اکتوبر ۳۲۵ ق م میں جنوب کی طرف لے جا رہا تھا۔ بیڑے کی حفاظت کے لئے باقی ماندہ یونانی فوج دریا کے دونوں کنارے پر منزل بہ منزل آگے جا رہی تھی اور اس کے سپاہیوں کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار سے بھی اوپر بتائی گئی ہے۔

جہلم اور پنجاب کے سنگم یعنی پورس کی جنوب مغربی

راستے کی
لڑائیاں

۱۔ یونانیوں نے اپنے تلفظ میں ان سب مقامات کے نام اور پتے بہ تفصیل تحریر کئے ہیں لیکن پنجاب کے دریاؤں کی گزرگاہ اس دو ہزار برس میں کہیں سے کہیں ہو گئی ہے اور اس لئے ان کے پرانے سنگم یا کنارے کے شہروں کا اب سراغ بھگانا محال ہے۔ ۱۱

سرحد تک، کوئی خاص بات پیش نہیں آئی لیکن آگے چل کر سکندر نے راستے کے قریب بستیوں اور قبائل کو اپنا مطیع بنانا چاہا اور سب سے پہلی بڑی لڑائی آگے لاسوی نامی قوم سے پیش آئی۔ یونانی مورخوں نے ان کے پیادہ سپاہیوں کی تعداد تخمیناً ”چالیس ہزار“ بتائی ہے، جن میں سے ہزارہا قتل ہوئے اور ہزارہا غلام بنا کے بیچ دئے گئے۔ اسی طرح قریوں اور قلعوں پر خون و آتش کا مینہ برسنا ہوا، یونانی لشکر ملی یا مالوی اور اگسی دراک وغیرہ آزاد قبائل کی سرحد میں داخل ہوا جو راوی اور جہلم کے سنگم سے لے کر مشرق کی جانب راوی کے دونوں طرف آباد تھے اور ملی غالباً موجودہ ضلع منٹگری تک پھیلے ہوئے تھے۔ سنسکرت کی صرف و نحو کی ایک مثال میں اتفاق سے ان قوموں کا اصلی نام محفوظ رہ گیا اور مہا بھارت میں بھی کئی جگہ ان کا ذکر آیا ہے جس سے یہ تصدیق ہوتی ہے کہ پہلی قوم مالو اور دوسری کشدراکا کہلاتی تھی۔ یونانی راوی لکھتے ہیں کہ ان ہمایہ قوموں نے اپنے بھگڑے بھلا کر سکندر کے مقابلے میں ایکا کرنا چاہا تھا مگر ابھی وہ یہی بحث کر رہے تھے کہ سپہ سالاری کس قوم کے آدمی کو دی جائے کہ سکندر نے ایک بیک قوم مالو پر تاخت کی اور اس حال میں کہ وہ بے ہتھیار اپنے کھیتوں میں کام کر رہے تھے، ان کے ہزاروں آدمی مار ڈالے۔

پھر شمال مشرق میں بہت دور تک ان کا پیچھا کیا اور کہیں انہیں دم لینے کی مہلت نہ دی۔ آخر وہ راوی کے دوسرے کنارے پر ایک قلعے میں پناہ گزین ہوئے اور وہیں سکندر کے خطرناک تہوّر کا وہ واقعہ پیش آیا جس میں وہ خود قلعے کی فصیل پر چڑھ گیا اور دوسری طرف محصورین کے جمع میں کود پڑا تھا۔ صرف دو آدمی اس کے ساتھ فصیل پر چڑھ سکے تھے اور پھر جوش میں یکبارگی بہت سے سپاہیوں کے چڑھنے سے وہ سیڑھیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ غرض بہت دیر تک وہ دشمنوں میں گھبر کر تنہا لڑتا رہا اور آخر مقدونی فوج بہ مشکل کسی نہ کسی طرح قلعے میں گھس آئی تو زخمی بادشاہ کو غش آ رہے تھے اور بعد میں کئی مہینے تک وہ صاحبِ فرّاش رہا۔

۳۲۵ء (ق م) کے آغاز میں یونانی لشکر پنجاب کی سرحد اور دریاؤں کے آخری سنگم سے بڑھ کر ملکِ سندھ میں داخل ہوا جہاں تین چار بڑی بڑی ریاستیں تھیں اور ان کے معاملات میں برہنوں کا بہت کچھ دخل تھا۔ چھ سات مہینے تک سکندر ان علاقوں میں تیغ زنی کرتا رہا اور جن رئیسوں نے اس کی اطاعت قبول نہیں کی وہ مارے گئے یا قید کر لئے گئے۔ سکندر کے ناگہانی حملوں نے ملک بھر میں ہلکے ڈال دیا تھا اور یونانی روایات کے یہ موجب صرف جنوبی سندھ کے معرکوں میں انہی ہزار ہندوستانی قتل ہوئے اور بے شمار مرد و عورت غلام بنا کے بیچ دئے گئے۔

آخر خدا خدا کر کے یہ سیلاب جس کا اُتار، چڑھاؤ سے بھی زیادہ خوفناک تھا، ممالک ہند سے دفع ہوا۔ شہر پشالا سے جو ان دنوں دریائے سندھ کے مثلث بنا دہانے کے نقطہ راس پر واقع تھا سکندر نے براہ کرمان ایران کی راہ لی اور بیڑا اپنے ایک سردار کو دیا کہ ساحل کے قریب قریب چل کر خلیج فارس میں دریائے فرات کے کنارے تک پہنچ جائے اور اپنے بھری سفر کی مفصل سرگذشت پیش کرے، خود سکندر اور یونانی لشکر اکتوبر ۳۲۵ ق م کے اخیر میں چار مہینے کا آذوقہ ساتھ لے کر موجودہ بلوچستان کے راستے ایران روانہ ہوئے کہ ساحل پر جا بجا بیڑے والوں کی آسانی کے لئے ٹھہرنے کے مقام اور سامان خور و نوش مہیا کر دیں لیکن تھوڑی دور چسل کر اپنی نادانقیت کے باعث وہ کوہ تلماری بند کے شمال میں بڑھ گئے اور ساحل بحر کی بجائے اس ریگستان کے سمندر میں جا گھسے جہاں پانی نایاب تھا اور اُس جاڑے کے موسم میں بھی دن کو بلا کی گرمی پڑتی تھی۔ سب سے بڑی مصیبت یہ کہ ریت میں سفر کرنا عذاب ہو گیا تھا اور انسان و حیوان کے پاؤں اندر دھنسے جاتے تھے۔ اس چند روز کی صحرا نوردی میں جس قدر آدمی ضایع ہوئے اُن کی تعداد ہندوستان کی تمام لڑائیوں کے نقصانات سے زیادہ تھی۔ دوسرے جس قدر ٹوٹ کا مال

ہندوستان سے باندھ باندھ کر لائے تھے وہ سب اسی ریگستان میں جہاں اپنا چلنا دشوار تھا، تلف کر دینا پڑا، اور جان سلامت لے کے گدروسیہ (کرمان) کے قدیم صدر مقام پورا (موجودہ باپور) میں پہنچ جانا ہی بہت نعمت سمجھے (جنوری ۳۲۳ ق م) بھوک پیاس کے مارے سپاہیوں نے کئی ہفتے یہاں آرام لیا پھر آہستہ آہستہ سفر کرتے ہوئے شاید ماہ مئی کے آغاز میں سوسس پہنچ گئے؛

ہندوستانی
صوبوں کا
آزاد ہوجانا

سکندر کو ہندوستان سے پیٹھ پھرتے دیر نہ ہوئی تھی کہ اس کے نئے مقبوضات میں بناوٹیں ہونے لگیں دریائے سندھ کے مشرق میں اُس نے براہ راست اپنا قبضہ نہیں رکھا تھا لیکن جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، مغرب میں اس نے اپنی سلطنت کے دو صوبے بنائے تھے اور ان کی حدود قریب قریب وہی تھیں جو آج کل صوبہ سرحدی اور ملک سندھ کی ہیں۔ اس اعتبار سے کہ وہ ہندوستان پر مئی ۳۲۳ ق م میں بڑھا اور ۳۲۲ ق م کے اسی مہینے میں واپس پائے تخت ایران میں پہنچ گیا، سکندر کی ہندی مہم میں تین سال صرف ہوئے مگر سرحد ہندوستان سے رخصت ہوئے شاید تین مہینے بھی نہ گزرے ہوں گے کہ شمالی صوبے کے اجیر (ہندی؟) سپاہیوں نے سازش کی اور وہاں کا یونانی عامل انہی اہل سازش کے ہاتھ سے مارا گیا، پھر ان بید علاقوں پر قبضہ رکھنے کی سکندر نے جو تدابیر سوچی تھیں وہ عمل میں آنے نہ پائی تھیں کہ اگلے سال

موت نے خود اس کا کام تمام کر دیا (جون ۳۲۳ ق م) اور تھوڑے ہی عرصے میں نہ صرف یہ ہندی مقبوضات آزاد ہو گئے بلکہ ان یونانیوں تک کا کچھ پتہ نہ چلا جنہیں سکندر نے اپنے بنا کردہ ہندوستانی شہروں میں بسا دیا تھا۔

ہاں ہم، یورپ کے بعض مصنف سکندر کے اس حملے کو یونانیوں کا عجیب و غریب کارنامہ بتاتے ہیں اور سکندر کے غیر معمولی اوصاف کی طرح میں انہوں نے صفحے کے صفحے بھر دئے ہیں، حالانکہ اگر یونانی روایات کی بلا رو رعایت تنقید کی جائے تو غالباً نتیجہ برعکس نکلے گا اور اس حملے میں نہ یونانیوں کی بہادری نظر آئے گی نہ دانائی نہ کامیابی! بلکہ ہندوستان کے چھوٹے چھوٹے رئیسوں کی لڑائیوں کو یونانیوں کا اس طرح بڑھا چڑھا کے بیان کرنا، پھر ان کے بقول سکندر کا قریب قریب ہر موقع پر بے خبری میں چھاپا مارنا، نہتے دشمن پر باگہاں ٹوٹ پڑنا (صفحہ ۷۲) یا دوستی کا عہد و پیمانہ کر کے یکایک حملہ کر دینا (صفحہ ۶۰) اس یونانی سورما کی جنگی قابلیت تک کو مشکوک کئے دیتا ہے۔ چنانچہ اس کی سپہ سالاری پر بھی جسے اب تک قریب قریب سب مانتے آئے تھے، تاریخ یونان کے نامور عالم ہیروڈوٹس نے حرف گیری کی ہے اور اس کی ذات کے متعلق تو گروٹ اور ٹی بہر جیسے اہل الرائے متفق ہیں کہ

سکندر نہایت شہرت پسند اور خود پرست جابر تھا جس میں شاہانِ جابر کے تمام بُرے اوصاف موجود تھے۔ اور ہمارے خیال میں اُس کے شوقِ خودنائی کا سب سے بڑا ثبوت وہ احکام ہیں جو ہندوستان سے چلتے وقت اس نے ایک بہت بڑی ”چھاؤنی“ بنانے کے متعلق دئے تھے۔ اس چھاؤنی میں سپاہیوں کے کمرے اور اُن کے پلنگ اور اسلحہ وغیرہ سب اتنے بڑے بڑے بنوائے تھے جن سے یہ گمان ہو کہ یہ کسی چو گزی مخلوق کے برتنے کا سازدسامان ہے۔ اور ان فرضی یادگاروں کو بیاس کے کنارے چھوڑ جانے کا منشاء یہ تھا کہ اہل ہند کے دل میں عرصہ دراز تک یونانیوں کی عظمت و ہیبت کا نقش رہے۔ یونانی راویوں کے متفق لفظ ہونے کے باوجود، ونسنٹ اسمتھ اس روایت کو ”سکندر اعظم“ کی شانِ متانت و وقار کے خلاف بتا کر، اس کی صحت سے انکار کرتا ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ جو بندہ لالیقل، سکندر کی مثل، بنی نوح سے اپنی پرستش کرائے، وہ اس قسم کی ہر ”لایعنی حرکت“ کا ارتکاب کر سکتا ہے!

اوصافِ ذاتی سے قطع نظر، خود یہ بات بحث طلب ہے کہ سکندر نے شاہِ فاتح کی حیثیت سے ہندوستان پر فوج کشی کی تھی یا راجہ ککلیلا کی مدد کے بھروسے پر محض شوقِ غارت گری اسے ادھر کھینچ لایا تھا۔ وجہ جو کچھ بھی ہو، اس میں کچھ شک

نہیں کہ یونانیوں نے سکندر اور اس کی فوج کی شجاعت و فتوحات کے متعلق جو عجیب عجیب افسانے مشہور کر رکھے ہیں، ہندوستان کی مہم میں ایک حد تک ان کی قلمی کھل جاتی ہے۔ قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دارائے ایران پر (جس کے ادنیٰ جاگیر دار پورس اور مکتاوس (سندھی) وغیرہ سے قوت و ثروت میں کہیں بڑھ چڑھ کر ہوں گے) سکندر کے اس قدر آسانی سے غالب آنے کی وجہ کیا تھی؟ مشرقی اور مغربی مصنفوں نے اس بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس پر بحث کرنے کا یہ محل نہیں ہمیں ہند و ایران کا صرف یہ فرق دکھانا مقصود ہے کہ ایرانیوں نے سکندر کو اپنا قومی بادشاہ بنا کے سجدہ کیا، مگر ہندوستان میں صرف سرحدی اضلاع پر اس کی جو کچھ آو بھگت ہوئی، وہ بالکل معمولی تھی اور اس کے جانے کے بعد تو بہت جلد اہل پنجاب و سندھ اس بات کو بھی بھول گئے کہ اس نام کا کوئی بادشاہ ان کے ملک پر حملہ آور ہوا تھا؟ اگرچہ سکندر کے اس حملے سے براہ راست ہندوستان پر کوئی نمایاں اثر نہیں پڑا نہ اس کی فتوحات دیرپا ثابت ہوئیں۔ این ہے۔ اہل مغرب کو شاید پہلی دفعہ تین بڑی اور ایک بھری راستے کا علم ہو گیا جن سے وہ تجارت یا سیاحت کرنے ہندوستان آ سکتے تھے۔ کچھ عرصے بعد باختر میں نیم یونانی سلطنت قائم ہوئی تو وہاں کے بادشاہ بھی انہی سکندری فتوحات کی بنا پر شمال مغربی ہند کی وراثت کا دعویٰ کرتے تھے۔ ان وجوہ کو پیش نظر

محلہ کے
پاؤں
نوائے

رکھ کر یہ کہنا کچھ بے بنیاد نہیں کہ حملہ سکندر کی یہ دولت مغرب و مشرق میں رابطہ باہمی کی نئی راہیں نکل آئیں اور ایک دوسرے سے مستفید ہونے کا موقع پیدا ہو گیا۔ چنانچہ بعض مصنفوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بودھ مت کے آئندہ تغیرات میں ان فلسفیانہ خیالات کو بھی دخل تھا جو یونان سے آئے تھے اور اسی طرح دین مسیحی کے بعض فرقوں نے بودھ مت کے عقائد اپنے مذہب میں شامل کر لئے تھے۔ یہ قیاسات غلط ہوں یا صحیح، اس بات کو بھولنا نہ چاہئے کہ ہندوستان کی قومی معاشرت یا نظام سلطنت پر تو یونان کا کوئی اثر نہیں پڑا اور فن جنگ تک میں اہل ہند نے وہ سبق بہت جلد بھلا دئے جو ”سکندر کی تیز تلوار نے انہیں دئے تھے۔ چنانچہ ہند کے بادشاہ اپنی رتھوں اور جنگی ہاتھیوں کے بل پر میدان میں نکلتے رہے، جیسا کہ قدیم سے دستور تھا x x x اور انہیں کبھی اس قسم کی جنگی قواعد اور یکبارگی حملے پر قدرت حاصل نہ ہوئی جو سکندر کی رسالے کی خصوصیات تھیں، اور جن سے سوٹھویں صدی عیسوی تک میں باہر نے کام لیا۔ اور کامیابی پائی۔“

(اوکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۶۷)

باب پنجم

پہلی فصل - چندرگپت کا زمانہ

چند سال ہوئے ریاست یسور کے سرکاری کتب خانہ سے کتاب "ارتھ شاستر" (یعنی اصول حکمرانی) کا ایک نسخہ برآمد ہوا جس کی تصنیف کو راجہ چندرگپت کے برہمن وزیر چانک یا کوتلیا نامی سے منسوب کرتے ہیں۔ اس شخص کے متعلق بعض کہانیوں میں لکھا ہے کہ وہ جتنا بد سرشت تھا اسی قدر خدا نے اسے بد صورت بنایا تھا، اس میں تو شک نہیں کہ چندرگپت کی تخت نشینی میں (۳۲۳ ق م) سازش و فریب کو بھی دخل تھا اور چونکہ گدھ کے پہلے فرماں روا (ہما پد نند راجہ) کو معزول اور قتل کرنے کے بعد رعایا کی وہ امیدیں پوری نہیں ہوئیں جو غالباً چندرگپت نے انہیں دلائی تھیں، پس عام طور پر اس کی طرف سے بد دلی پھیل گئی اور نئے بادشاہ کے تشدد کا الزام اس کے چالاک وزیر کے سر پڑا۔

علاؤلسٹ اسٹہ کا خیال ہے کہ ارتھ شاستر کے بعض فقروں سے مصنف "اتھرو وید" کا پیرو ثابت ہوتا ہے اور یہ خاص جادو اور شعبدوں کا وید سمجھا جاتا ہے۔ (اکسفورڈ

ہسٹری صفحہ ۸۵)

علاؤلسٹ چندرگپت کی جابرانہ سختی اور مطلق العنانی کے متعلق ملاحظہ ہو (اکسفورڈ

ہسٹری صفحہ ۸۵)؛

بہر حال ”ارتھ شاستر“ اس بدنام وزیر کی تصنیف ہو یا نہ ہو، اتنا تو مسلم ہے کہ وہ اسی چوتھی صدی ق م کے اواخر کی کتاب ہے اور اس میں خاص اپنے یا کچھ پہلے زمانے کے آئین مصتف کی پیش نظر تھے؛

”ارتھ شاستر“ میں واقعات تاریخی مذکور نہیں ہیں بلکہ اسے پڑھ کر ان کی طلب، اور نہونے کا تاسف، سوا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ بغیر ان کے ہم ان مابج ارتقائی کا کچھ پتہ نہیں چلا سکتے جنہیں طے کر کے ہندوستان شخصی حکومت کی اُس آخری منزل تک

پہنچ گیا تھا جس کا ارتھ شاستر میں حال بیان کیا گیا ہے؛ یاد رکھنا چاہئے کہ اپنی ابتدائی اور سادہ صورت میں شخصی حکومت محض بزرگت۔

یا شیخ قبیلہ کی حکومت ہوتی ہے اور اس میں حق وراثت کو بھی کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ریاست کا ناک موروثی بن جانا، شخصی حکومت کی دوسری منزل ارتقائی ہے اور اس کا آخری درجہ وہ ہے کہ بادشاہ موروثی اور بالکل مطلق العنان ہو اور کسی کو اس کے حکم کے خلاف لب کشائی کا حق نہ ہو۔ وہ ذرا سی بات پر جس دشمن سے چاہے لڑائی چھیڑ دے اور جن شرائط پر مناسب جانے صلح کر لے۔ ملک اس کی ذاتی جاگیر بن جائے اور اہل ملک آلات بیجان کی مثل اُس کے اشارے پر حرکت کریں!

شخصی حکومت کے اس درجہ تکمیل کے لئے سلطنت کا وسیع ہونا ضروری ہے کیونکہ کسی چھوٹی ریاست کے موروثی ملک کو خدائی کا دعویٰ نہیں ہو سکتا نہ زریب دیتا ہے۔ یہ دوسری

بلت ہے کہ بعد میں بڑے بڑے بادشاہوں کی چھوٹے رئیس بھی نقل
آٹارنی سیکھ جائیں اور اپنی اپنی جگہ وہی حرکتیں کرنے لگیں جن کی
رسم بڑے درباروں میں پڑی تھی؛ غرض تاریخ میں ہندوستان کی
پہلی شخصی حکومت سلطنت گدھہ میں قائم ہوئی اور اسی کے
واقعات تاریخی کی نامیستری کا افسوس ہے کہ اب ہم کسی طرح
ان اسباب و حالات کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے جن کی یہ دولت
اس مشرقی ریاست کو یہ فوج حاصل ہوا کہ اس کی سرحدیں بنگالے
سے پنجاب تک پھیل گئیں؛

اتنی بات یقینی ہے کہ چندرگپت نے بنائی سلطنت پر قبضہ
کیا تھا اور اس کی قوت ہندوستان کی تمام ریاستوں سے زیادہ
تھی؛ رومی مصنف پلینی کی کتاب میں ان ریاستوں کی فوجی قوت کا
باہم موازنہ کیا ہے:-

(۱) گدھہ	۶ لاکھ پیادہ	۳۰ ہزار سوار	۹ ہزار جنگی ہاتھی
(۲) کلنگ	۶۰ ہزار	۱۰ ہزار	۷ سو
(۳) تلکٹا	۵۰	۴ ہزار	" " "
(۴) آندھ	ایک لاکھ	۲	ایک ہزار

یہ عہد چندرگپت کے اعداد ہیں جو بلا شبہ مگاس تھینز کی کتاب

تند راجہ کی فوج ۲ لاکھ پیادہ ۳۰ ہزار سوار ۶ ہزار فیل جنگی پر مشتمل بتائی گئی ہے۔ (۱۰۷ صفحہ ۱۷۵)
لیکن پروفیسر ہنس ڈیوڈ کے نزدیک خود چندرگپت کے زمانے میں پیادہ فوج کی تعداد ۶۰ ہزار ہونی
چاہئے جو کاتب کی غلطی سے ۶ لاکھ بن گئی ہے۔ ص ۲۶۶؛

توسن
سلطنت

”اندکا“ سے ماخوذ ہوں گے، اور اگر بالکل صحیح نہ مانے جائیں تو بھی یہ ظاہر ہے کہ گدہہ کی سلطنت سب پر فائق تھی اور نہ صرف کوسل کا قدیم راج اس میں جذب ہو چکا تھا، بلکہ سکندر کے جاتے ہی پنجاب بھی اس کی حدود میں داخل ہو گیا تھا۔ اور یہ دونوں اتنے قریب کے واقعات ہیں کہ ممکن ہے ان میں اور سکندر کی ہندوستان سے پسپائی میں کوئی تعلق ہو یعنی گدہہ کا نند راجہ یا اس کا عزیز چندرگپت سکندر ہی کو روکنے کے لئے بڑھا ہو اور سکندر یا اس کی فوج کو ہندی ٹڈی دل کا سامنا کرنے کی ہمت نہ پڑی ہو اور وہ سڑجھ ہی سے لوٹ مار کرتے واپس چلے گئے ہوں! کسی یونانی یا مغربی مصنف کی تحریر سے اس قیاس کی تائید چاہنا فضول ہے۔ ان سب نے سکندر کو بالاتفاق اتنا بڑا کشور کشا اور غیر معمولی سپہ سالار بنایا ہے کہ جس کے مقابلے میں دنیا کی کوئی قوت نہ ٹھہر سکتی تھی۔ قدیم ایران کے اثر سے دور متوسط کے مسلمانوں میں بھی اسی قسم کے عجیب عجیب افسانے مشہور ہو گئے تھے اور حال میں جن علما نے (جیسے جرمن پروفیسر ہیلمون نے) اس کی سپہ سالاری پر حرف زنی کی ہے انہوں نے بھی بالعموم ہندوستانی ہم کی یونانی روایات کو بجنہ تسلیم کر لیا ہے حالانکہ ان کے مباحثہ آمیز ہونے سے کسی کو بھی انکار نہیں تو ان غیر اہم قرائن سے

۱۔ پلینی کا قول ہے کہ سکندر کے حملے کے وقت بھی دریائے سندھ تک گدہہ کے راہ

کی عملدرآمد تھی۔ برصغیر، ص ۲۶۷۔ ۲۶۸۔ ۲۶۹۔ ۲۷۰۔ ۲۷۱۔ ۲۷۲۔ ۲۷۳۔ ۲۷۴۔ ۲۷۵۔ ۲۷۶۔ ۲۷۷۔ ۲۷۸۔ ۲۷۹۔ ۲۸۰۔ ۲۸۱۔ ۲۸۲۔ ۲۸۳۔ ۲۸۴۔ ۲۸۵۔ ۲۸۶۔ ۲۸۷۔ ۲۸۸۔ ۲۸۹۔ ۲۹۰۔ ۲۹۱۔ ۲۹۲۔ ۲۹۳۔ ۲۹۴۔ ۲۹۵۔ ۲۹۶۔ ۲۹۷۔ ۲۹۸۔ ۲۹۹۔ ۳۰۰۔ ۳۰۱۔ ۳۰۲۔ ۳۰۳۔ ۳۰۴۔ ۳۰۵۔ ۳۰۶۔ ۳۰۷۔ ۳۰۸۔ ۳۰۹۔ ۳۱۰۔ ۳۱۱۔ ۳۱۲۔ ۳۱۳۔ ۳۱۴۔ ۳۱۵۔ ۳۱۶۔ ۳۱۷۔ ۳۱۸۔ ۳۱۹۔ ۳۲۰۔ ۳۲۱۔ ۳۲۲۔ ۳۲۳۔ ۳۲۴۔ ۳۲۵۔ ۳۲۶۔ ۳۲۷۔ ۳۲۸۔ ۳۲۹۔ ۳۳۰۔ ۳۳۱۔ ۳۳۲۔ ۳۳۳۔ ۳۳۴۔ ۳۳۵۔ ۳۳۶۔ ۳۳۷۔ ۳۳۸۔ ۳۳۹۔ ۳۴۰۔ ۳۴۱۔ ۳۴۲۔ ۳۴۳۔ ۳۴۴۔ ۳۴۵۔ ۳۴۶۔ ۳۴۷۔ ۳۴۸۔ ۳۴۹۔ ۳۵۰۔ ۳۵۱۔ ۳۵۲۔ ۳۵۳۔ ۳۵۴۔ ۳۵۵۔ ۳۵۶۔ ۳۵۷۔ ۳۵۸۔ ۳۵۹۔ ۳۶۰۔ ۳۶۱۔ ۳۶۲۔ ۳۶۳۔ ۳۶۴۔ ۳۶۵۔ ۳۶۶۔ ۳۶۷۔ ۳۶۸۔ ۳۶۹۔ ۳۷۰۔ ۳۷۱۔ ۳۷۲۔ ۳۷۳۔ ۳۷۴۔ ۳۷۵۔ ۳۷۶۔ ۳۷۷۔ ۳۷۸۔ ۳۷۹۔ ۳۸۰۔ ۳۸۱۔ ۳۸۲۔ ۳۸۳۔ ۳۸۴۔ ۳۸۵۔ ۳۸۶۔ ۳۸۷۔ ۳۸۸۔ ۳۸۹۔ ۳۹۰۔ ۳۹۱۔ ۳۹۲۔ ۳۹۳۔ ۳۹۴۔ ۳۹۵۔ ۳۹۶۔ ۳۹۷۔ ۳۹۸۔ ۳۹۹۔ ۴۰۰۔ ۴۰۱۔ ۴۰۲۔ ۴۰۳۔ ۴۰۴۔ ۴۰۵۔ ۴۰۶۔ ۴۰۷۔ ۴۰۸۔ ۴۰۹۔ ۴۱۰۔ ۴۱۱۔ ۴۱۲۔ ۴۱۳۔ ۴۱۴۔ ۴۱۵۔ ۴۱۶۔ ۴۱۷۔ ۴۱۸۔ ۴۱۹۔ ۴۲۰۔ ۴۲۱۔ ۴۲۲۔ ۴۲۳۔ ۴۲۴۔ ۴۲۵۔ ۴۲۶۔ ۴۲۷۔ ۴۲۸۔ ۴۲۹۔ ۴۳۰۔ ۴۳۱۔ ۴۳۲۔ ۴۳۳۔ ۴۳۴۔ ۴۳۵۔ ۴۳۶۔ ۴۳۷۔ ۴۳۸۔ ۴۳۹۔ ۴۴۰۔ ۴۴۱۔ ۴۴۲۔ ۴۴۳۔ ۴۴۴۔ ۴۴۵۔ ۴۴۶۔ ۴۴۷۔ ۴۴۸۔ ۴۴۹۔ ۴۵۰۔ ۴۵۱۔ ۴۵۲۔ ۴۵۳۔ ۴۵۴۔ ۴۵۵۔ ۴۵۶۔ ۴۵۷۔ ۴۵۸۔ ۴۵۹۔ ۴۶۰۔ ۴۶۱۔ ۴۶۲۔ ۴۶۳۔ ۴۶۴۔ ۴۶۵۔ ۴۶۶۔ ۴۶۷۔ ۴۶۸۔ ۴۶۹۔ ۴۷۰۔ ۴۷۱۔ ۴۷۲۔ ۴۷۳۔ ۴۷۴۔ ۴۷۵۔ ۴۷۶۔ ۴۷۷۔ ۴۷۸۔ ۴۷۹۔ ۴۸۰۔ ۴۸۱۔ ۴۸۲۔ ۴۸۳۔ ۴۸۴۔ ۴۸۵۔ ۴۸۶۔ ۴۸۷۔ ۴۸۸۔ ۴۸۹۔ ۴۹۰۔ ۴۹۱۔ ۴۹۲۔ ۴۹۳۔ ۴۹۴۔ ۴۹۵۔ ۴۹۶۔ ۴۹۷۔ ۴۹۸۔ ۴۹۹۔ ۵۰۰۔ ۵۰۱۔ ۵۰۲۔ ۵۰۳۔ ۵۰۴۔ ۵۰۵۔ ۵۰۶۔ ۵۰۷۔ ۵۰۸۔ ۵۰۹۔ ۵۱۰۔ ۵۱۱۔ ۵۱۲۔ ۵۱۳۔ ۵۱۴۔ ۵۱۵۔ ۵۱۶۔ ۵۱۷۔ ۵۱۸۔ ۵۱۹۔ ۵۲۰۔ ۵۲۱۔ ۵۲۲۔ ۵۲۳۔ ۵۲۴۔ ۵۲۵۔ ۵۲۶۔ ۵۲۷۔ ۵۲۸۔ ۵۲۹۔ ۵۳۰۔ ۵۳۱۔ ۵۳۲۔ ۵۳۳۔ ۵۳۴۔ ۵۳۵۔ ۵۳۶۔ ۵۳۷۔ ۵۳۸۔ ۵۳۹۔ ۵۴۰۔ ۵۴۱۔ ۵۴۲۔ ۵۴۳۔ ۵۴۴۔ ۵۴۵۔ ۵۴۶۔ ۵۴۷۔ ۵۴۸۔ ۵۴۹۔ ۵۵۰۔ ۵۵۱۔ ۵۵۲۔ ۵۵۳۔ ۵۵۴۔ ۵۵۵۔ ۵۵۶۔ ۵۵۷۔ ۵۵۸۔ ۵۵۹۔ ۵۶۰۔ ۵۶۱۔ ۵۶۲۔ ۵۶۳۔ ۵۶۴۔ ۵۶۵۔ ۵۶۶۔ ۵۶۷۔ ۵۶۸۔ ۵۶۹۔ ۵۷۰۔ ۵۷۱۔ ۵۷۲۔ ۵۷۳۔ ۵۷۴۔ ۵۷۵۔ ۵۷۶۔ ۵۷۷۔ ۵۷۸۔ ۵۷۹۔ ۵۸۰۔ ۵۸۱۔ ۵۸۲۔ ۵۸۳۔ ۵۸۴۔ ۵۸۵۔ ۵۸۶۔ ۵۸۷۔ ۵۸۸۔ ۵۸۹۔ ۵۹۰۔ ۵۹۱۔ ۵۹۲۔ ۵۹۳۔ ۵۹۴۔ ۵۹۵۔ ۵۹۶۔ ۵۹۷۔ ۵۹۸۔ ۵۹۹۔ ۶۰۰۔ ۶۰۱۔ ۶۰۲۔ ۶۰۳۔ ۶۰۴۔ ۶۰۵۔ ۶۰۶۔ ۶۰۷۔ ۶۰۸۔ ۶۰۹۔ ۶۱۰۔ ۶۱۱۔ ۶۱۲۔ ۶۱۳۔ ۶۱۴۔ ۶۱۵۔ ۶۱۶۔ ۶۱۷۔ ۶۱۸۔ ۶۱۹۔ ۶۲۰۔ ۶۲۱۔ ۶۲۲۔ ۶۲۳۔ ۶۲۴۔ ۶۲۵۔ ۶۲۶۔ ۶۲۷۔ ۶۲۸۔ ۶۲۹۔ ۶۳۰۔ ۶۳۱۔ ۶۳۲۔ ۶۳۳۔ ۶۳۴۔ ۶۳۵۔ ۶۳۶۔ ۶۳۷۔ ۶۳۸۔ ۶۳۹۔ ۶۴۰۔ ۶۴۱۔ ۶۴۲۔ ۶۴۳۔ ۶۴۴۔ ۶۴۵۔ ۶۴۶۔ ۶۴۷۔ ۶۴۸۔ ۶۴۹۔ ۶۵۰۔ ۶۵۱۔ ۶۵۲۔ ۶۵۳۔ ۶۵۴۔ ۶۵۵۔ ۶۵۶۔ ۶۵۷۔ ۶۵۸۔ ۶۵۹۔ ۶۶۰۔ ۶۶۱۔ ۶۶۲۔ ۶۶۳۔ ۶۶۴۔ ۶۶۵۔ ۶۶۶۔ ۶۶۷۔ ۶۶۸۔ ۶۶۹۔ ۶۷۰۔ ۶۷۱۔ ۶۷۲۔ ۶۷۳۔ ۶۷۴۔ ۶۷۵۔ ۶۷۶۔ ۶۷۷۔ ۶۷۸۔ ۶۷۹۔ ۶۸۰۔ ۶۸۱۔ ۶۸۲۔ ۶۸۳۔ ۶۸۴۔ ۶۸۵۔ ۶۸۶۔ ۶۸۷۔ ۶۸۸۔ ۶۸۹۔ ۶۹۰۔ ۶۹۱۔ ۶۹۲۔ ۶۹۳۔ ۶۹۴۔ ۶۹۵۔ ۶۹۶۔ ۶۹۷۔ ۶۹۸۔ ۶۹۹۔ ۷۰۰۔ ۷۰۱۔ ۷۰۲۔ ۷۰۳۔ ۷۰۴۔ ۷۰۵۔ ۷۰۶۔ ۷۰۷۔ ۷۰۸۔ ۷۰۹۔ ۷۱۰۔ ۷۱۱۔ ۷۱۲۔ ۷۱۳۔ ۷۱۴۔ ۷۱۵۔ ۷۱۶۔ ۷۱۷۔ ۷۱۸۔ ۷۱۹۔ ۷۲۰۔ ۷۲۱۔ ۷۲۲۔ ۷۲۳۔ ۷۲۴۔ ۷۲۵۔ ۷۲۶۔ ۷۲۷۔ ۷۲۸۔ ۷۲۹۔ ۷۳۰۔ ۷۳۱۔ ۷۳۲۔ ۷۳۳۔ ۷۳۴۔ ۷۳۵۔ ۷۳۶۔ ۷۳۷۔ ۷۳۸۔ ۷۳۹۔ ۷۴۰۔ ۷۴۱۔ ۷۴۲۔ ۷۴۳۔ ۷۴۴۔ ۷۴۵۔ ۷۴۶۔ ۷۴۷۔ ۷۴۸۔ ۷۴۹۔ ۷۵۰۔ ۷۵۱۔ ۷۵۲۔ ۷۵۳۔ ۷۵۴۔ ۷۵۵۔ ۷۵۶۔ ۷۵۷۔ ۷۵۸۔ ۷۵۹۔ ۷۶۰۔ ۷۶۱۔ ۷۶۲۔ ۷۶۳۔ ۷۶۴۔ ۷۶۵۔ ۷۶۶۔ ۷۶۷۔ ۷۶۸۔ ۷۶۹۔ ۷۷۰۔ ۷۷۱۔ ۷۷۲۔ ۷۷۳۔ ۷۷۴۔ ۷۷۵۔ ۷۷۶۔ ۷۷۷۔ ۷۷۸۔ ۷۷۹۔ ۷۸۰۔ ۷۸۱۔ ۷۸۲۔ ۷۸۳۔ ۷۸۴۔ ۷۸۵۔ ۷۸۶۔ ۷۸۷۔ ۷۸۸۔ ۷۸۹۔ ۷۹۰۔ ۷۹۱۔ ۷۹۲۔ ۷۹۳۔ ۷۹۴۔ ۷۹۵۔ ۷۹۶۔ ۷۹۷۔ ۷۹۸۔ ۷۹۹۔ ۸۰۰۔ ۸۰۱۔ ۸۰۲۔ ۸۰۳۔ ۸۰۴۔ ۸۰۵۔ ۸۰۶۔ ۸۰۷۔ ۸۰۸۔ ۸۰۹۔ ۸۱۰۔ ۸۱۱۔ ۸۱۲۔ ۸۱۳۔ ۸۱۴۔ ۸۱۵۔ ۸۱۶۔ ۸۱۷۔ ۸۱۸۔ ۸۱۹۔ ۸۲۰۔ ۸۲۱۔ ۸۲۲۔ ۸۲۳۔ ۸۲۴۔ ۸۲۵۔ ۸۲۶۔ ۸۲۷۔ ۸۲۸۔ ۸۲۹۔ ۸۳۰۔ ۸۳۱۔ ۸۳۲۔ ۸۳۳۔ ۸۳۴۔ ۸۳۵۔ ۸۳۶۔ ۸۳۷۔ ۸۳۸۔ ۸۳۹۔ ۸۴۰۔ ۸۴۱۔ ۸۴۲۔ ۸۴۳۔ ۸۴۴۔ ۸۴۵۔ ۸۴۶۔ ۸۴۷۔ ۸۴۸۔ ۸۴۹۔ ۸۵۰۔ ۸۵۱۔ ۸۵۲۔ ۸۵۳۔ ۸۵۴۔ ۸۵۵۔ ۸۵۶۔ ۸۵۷۔ ۸۵۸۔ ۸۵۹۔ ۸۶۰۔ ۸۶۱۔ ۸۶۲۔ ۸۶۳۔ ۸۶۴۔ ۸۶۵۔ ۸۶۶۔ ۸۶۷۔ ۸۶۸۔ ۸۶۹۔ ۸۷۰۔ ۸۷۱۔ ۸۷۲۔ ۸۷۳۔ ۸۷۴۔ ۸۷۵۔ ۸۷۶۔ ۸۷۷۔ ۸۷۸۔ ۸۷۹۔ ۸۸۰۔ ۸۸۱۔ ۸۸۲۔ ۸۸۳۔ ۸۸۴۔ ۸۸۵۔ ۸۸۶۔ ۸۸۷۔ ۸۸۸۔ ۸۸۹۔ ۸۹۰۔ ۸۹۱۔ ۸۹۲۔ ۸۹۳۔ ۸۹۴۔ ۸۹۵۔ ۸۹۶۔ ۸۹۷۔ ۸۹۸۔ ۸۹۹۔ ۹۰۰۔ ۹۰۱۔ ۹۰۲۔ ۹۰۳۔ ۹۰۴۔ ۹۰۵۔ ۹۰۶۔ ۹۰۷۔ ۹۰۸۔ ۹۰۹۔ ۹۱۰۔ ۹۱۱۔ ۹۱۲۔ ۹۱۳۔ ۹۱۴۔ ۹۱۵۔ ۹۱۶۔ ۹۱۷۔ ۹۱۸۔ ۹۱۹۔ ۹۲۰۔ ۹۲۱۔ ۹۲۲۔ ۹۲۳۔ ۹۲۴۔ ۹۲۵۔ ۹۲۶۔ ۹۲۷۔ ۹۲۸۔ ۹۲۹۔ ۹۳۰۔ ۹۳۱۔ ۹۳۲۔ ۹۳۳۔ ۹۳۴۔ ۹۳۵۔ ۹۳۶۔ ۹۳۷۔ ۹۳۸۔ ۹۳۹۔ ۹۴۰۔ ۹۴۱۔ ۹۴۲۔ ۹۴۳۔ ۹۴۴۔ ۹۴۵۔ ۹۴۶۔ ۹۴۷۔ ۹۴۸۔ ۹۴۹۔ ۹۵۰۔ ۹۵۱۔ ۹۵۲۔ ۹۵۳۔ ۹۵۴۔ ۹۵۵۔ ۹۵۶۔ ۹۵۷۔ ۹۵۸۔ ۹۵۹۔ ۹۶۰۔ ۹۶۱۔ ۹۶۲۔ ۹۶۳۔ ۹۶۴۔ ۹۶۵۔ ۹۶۶۔ ۹۶۷۔ ۹۶۸۔ ۹۶۹۔ ۹۷۰۔ ۹۷۱۔ ۹۷۲۔ ۹۷۳۔ ۹۷۴۔ ۹۷۵۔ ۹۷۶۔ ۹۷۷۔ ۹۷۸۔ ۹۷۹۔ ۹۸۰۔ ۹۸۱۔ ۹۸۲۔ ۹۸۳۔ ۹۸۴۔ ۹۸۵۔ ۹۸۶۔ ۹۸۷۔ ۹۸۸۔ ۹۸۹۔ ۹۹۰۔ ۹۹۱۔ ۹۹۲۔ ۹۹۳۔ ۹۹۴۔ ۹۹۵۔ ۹۹۶۔ ۹۹۷۔ ۹۹۸۔ ۹۹۹۔ ۱۰۰۰۔

قطع نظر جن پر مفصل بحث کرنے کی اس کتاب میں گنجائش نہیں، خود یہی واقعہ کہ سلطنتِ ق م میں چندرگپت نے سلیوکوس (سلوکس) کو شکست فاش دے کر کوہستانِ سلیمان کے پار کا وہ سارا ملک لے لیا، جو اب دولتِ افغانستان کہلاتا ہے، مذکورہ بالا قیاس کی بالواسطہ تائید میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ جنگی ساز و سامان اور غالباً تعداد کے اعتبار سے، سلیوکوس کا لشکر اپنے نامور آقا سے کہیں زیادہ طاقتور تھا اور بعض اقوال کے بہ موجب سلیوکوس نہ صرف سکندر کے مفتوحہ علاقے واپس لینا چاہتا تھا بلکہ مشرقی ممالک گنگا پر بھی اس کی نظر تھی۔ کم سے کم وہ ان کے مقابلے کے لئے تیار ہو کر آیا تھا۔ بایں ہمہ لڑائی میں شکست کھائی اور اُلٹے اپنے تین صوبے (ست راپ) ہند کے فاتحِ راجہ کے حوالے کرنے پڑے۔ دوستانہ اور عزیزانہ تعلقات پیدا کرنے کی غرض سے اس نے اپنی بیٹی بھی چندرگپت کو بیاہ دی تھی۔ اور اسی کے ہمراہ یونانی سفیر مگاس تھینز پائلٹی پترا میں بھیجا گیا تھا۔

دوسری فصل۔ مگاس تھینز کی تحریریں

یہ سفیر بہت دن تک گدہ کے پائے تخت میں رہا اور اس نے ہندوستان کے جغرافیہ اور سیاسی حالات لکھے جن میں

کچھ اُس کے ذاتی مشاہدات پر مبنی تھے اور بہت سی باتیں سستی سنائی جمع کر دی تھیں۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں، مگاس تھنیز کی اصل کتاب منقود ہو گئی اور اب اس کے صرف وہ اجزا ملتے ہیں جنہیں دوسرے مصنفوں (خاص کر ایرانیان) نے نقل کیا ہے۔ اور ان منقولات میں بہت سے قصے ایسے ناقابل اعتبار ہیں کہ بعض اہل الرائے نہ مگاس تھنیز کو سچا جانتے ہیں اور نہ اس بات کا انہیں اطمینان ہے کہ یونانی مصنفوں نے اس کے اقوال بجنسہ اور بلا کم و کاست نقل کر دیئے ہیں۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ مگاس تھنیز جس تمدن میں خود پلا تھا، ہندوستان کا تمدن اس سے بالکل مختلف تھا اور اس لئے وہ یہاں کی ہر چیز اور ہر آئین و رسم کو سخت حیرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور یہاں کی زبان اور عادات سے بہ خوبی واقف نہ ہونے کے باعث بعض باتوں کے کچھ سے کچھ معنی سمجھ لیتا ہے۔ جیسا کہ آج کل بھی تازہ ولایت انگریز ہندوستانیوں کے متعلق بعض اوقات عجیب عجیب خیالات قائم کر لیتے ہیں، مختصر یہ کہ اُس کی تحریر یا وہ اقوال جو اس سے منسوب ہیں، مطالعہ کرتے وقت ہمیں یہ تمام اسقام اور غلطی کے امکانات مد نظر رکھنے چاہئیں۔

چندرگپت کی نسبت مگاس تھنیز کہتا ہے کہ وہ بالعموم

راجکلی ذات
و مشاغل

محل کے اندر اپنی خواصوں میں گھرا رہتا ہے مگر دن میں ایک مرتبہ اُسے (یعنی بادشاہ کو) اپنی صورت لوگوں کو دکھانی ضروری ہے اور انہی اوقات میں وہ فریادیوں کی فریاد سنتا اور مقدمات کا فیصلہ کرتا ہے۔ جب وہ باہر آکر بیٹھے تو رسم ہے کہ چار نوکر اس کی چپتی کرتے اور ہاتھ پاؤں دباتے ہیں پُر شکار کا اُسے بہت شوق ہے اور اس کے لئے ہانکا دے کر جنگلی جانوروں کو ایک مخصوص احاطے میں پہنچا دیا جاتا ہے جہاں وہ تیر سے اُن کا شکار کرتا ہے پُر ہاتھی، گینڈے، سانڈ اور مینڈھے کی لڑائی بادشاہ کی تفریح کا سامان ہے اور کبھی کبھی اس کے حضور میں پہلوانوں کی گشتیاں بھی ہوتی ہیں پُر

شاہی محلات کے متعلق مگاس تخنیز کا بیان ہے کہ وہ سوس، وہمان کے ایرانی محلوں سے بھی آرایش و شان شوکت میں بڑھے چڑھے تھے۔ یہ عمارتیں زیادہ تر لکڑی کی بنائی جاتی

محلات
شاہی

۱۔ چندرگپت کے ”دربار میں تربیت یافتہ طوائف کی بڑی قند ہوتی تھی اور یہ رسم بدھ پورے میں پہلے تک ہندوستانی رئیسوں کے پاس جاری تھی بلکہ بعض مقامات پر شاید اب بھی جاری ہوئے چندرگپت کی سرکاری عورتیں غلامہ کی حیثیت سے گھر کا کام کاج کرتی تھیں۔ عطر لگانا، ہار گوندہ کے پہنانا، پتھر برداری وغیرہ کی خدمات انجام دیتی تھیں۔ اور دربار میں سواری کے وقت جلو میں رہتی تھیں، عام رہنویوں کی بھی سرکاری طوق پر پوری نگرانی رکھی جاتی تھی اور اُن کو کچھ روپیہ سرکاری خزانے میں داخل کرنا پڑتا تھا۔ سولہویں صدی عیسوی میں دکن کی ریاست بچے نگر (Vijayanagar) میں اس قسم کی رسوم کا ثبوت ملتا ہے مگر حکومت

موترا کے محلو سولہ رسانی کو ان رہنویوں سے خفیہ معلومات حاصل کرنے میں بھی کچھ نارتھ (اؤکسفورڈ پریس صفحہ ۷۹)

تھیں لیکن ان کے ستون و رواق کو سونے کے پانی سے رنگ کر ان پر جا بہ جا سونے چاندی کی بیللیں چڑھاتے جن کی شانوں پر زینہ سز طہور بنے ہوئے ہوتے تھے پڑرو جواہرات کی یہ کثرت اب سے دو صدی پہلے تک ملک ہندوستان کا مایہ امتیاز تھی لیکن یاد رکھنے کے لائق بات یہ ہے کہ اس قدیم زمانے میں بھی تہذیب و تمدن خاص کر شاہی آداب اور سامان عشرت و تکلفات میں ہندوستان کے درباروں پر ایران کا اثر نمایاں تھا اور وہاں کے بعض طریقوں کی تقلید کی جاتی تھی؛

شہر
پانلی چا

پائے تخت کے بیان میں مگاس تھینز کی کئی تحریریں محفوظ ہیں قدیم ہندوستان کا یہ نامور شہر سون اور گنگا کے سنگم پر واقع تھا جہاں اب ”پٹنہ“ اور بانکی پور آباد ہیں۔ اور ان کی مینل اُس کی آبادی بھی عرصاً کم اور طولاً دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ حفاظت کے لئے اس کے گرد شہتیروں کی نہایت مستحکم اور چوڑی شہر پناہ بنائی تھی جس میں ۶۳ دروازے اور ۵۷۰ برج تھے اور فصیل کی خندق کے لئے سون کا پانی آتا تھا۔ مگاس تھینز اس خندق کا عرض دو سو گز اور گہرائی ۳۰ فٹ بتاتا ہے۔ اور اتنی

۱۱ شلاً راجہ بیماری میں ”مقدس آتش“ کے رو برو بیٹھ کر اطبا سے مشورہ کرتا تھا یا ”سردھائی“ کا دھوم دھام سے جلسہ کیا جاتا تھا اور یہ وہ رسم ہے جو شاہان ایران جشن ساگرہ کے وقت مناتے تھے۔ (آکسفورڈ ہسٹری۔ صفحہ ۷۹)

عریض خندق دنیا میں بہت کم کسی شہر پناہ کے گرد بنی ہوگی؛ لیکن شاید سب سے زیادہ قابل ذکر وہ شہری مجلسین ہیں جن کا مگاس تھنیز نے تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ کوئی جماعت تو صنعت و تجارت کی نگرانی کرتی تھی اور کسی کے سپرد اہل شہر کی ولادت و اموات لکھنے کا کام تھا تاکہ سرکار کو رعایا کے حال کی خبر رہے اور محصولات کے لگانے میں آسانی ہو، شہر کی ان سرکاری مجلسوں کے فرائض و ضوابط اتنی وضاحت سے بیان کئے گئے ہیں کہ بعض جزئیات پڑگو راوی کی من گھڑت معلوم ہوتی ہیں اور بعض اوقات شبہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ تمام ”شہری نظام“ کسی ذہین یونانی مصنف کا نتیجہ فکر نہ ہو جس نے اپنے شہروالوں کو توجہ دلانے کی غرض سے مگاس تھنیز کا قول بنا کر اسے پاٹلی پترا سے منسوب کر دیا اور بعد میں عام طور پر اس کی روایت کو لوگ صحیح سمجھنے لگے؟

تعداد فوج کے متعلق ہم اوپر پڑھ آئے ہیں کہ راجہ چندر گپت کے زمانے میں گدھ کی جنگی قوت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی اور اس کے لشکر میں ۶ لاکھ پیادہ ۳۰ ہزار سوار اور ۹ ہزار ہاتھی تھے۔ جہاوت کے علاوہ ہر ہاتھی پر تین تیر انداز ہوتے اور یہ میدان جنگ میں آج کل کے توپ خانے کی طرح سب سے آگے آگے رہتے تھے۔ ان کے سوا ۸ ہزار جنگی رتھیں تھیں اور ہر ایک میں کم سے کم تین لڑنے والے سپاہی ہوتے تھے رتھ میں دو

فوجی نظم
اور اسلحہ

اور بعض اوقات چار گھوڑے لگاتے اور یہ بالعموم سواروں کے ساتھ فوج کے بازوؤں پر رہتی تھیں۔ سواروں کے پاس صرف دو بھالے اور ایک ڈھال ہوتی تھی لیکن پیادہ سپاہی تیغ سے مسلح ہوتے اور سانگ یعنی چھوٹی برچھی (جسے پھینک کر مارتے ہیں) یا تیر کمان لئے رہتے تھے؛

یاد رکھنا چاہئے کہ یہ تمام فوج ایسے تنخواہ دار سپاہیوں کی تھی جن کا پیشہ ہی سپہ گری تھا اور جو اپنی چھاندنیوں میں انہی مشاغل میں مصروف اور بادشاہ کے حکم پر جنگ کے لئے تیار رہتے تھے۔ ان کی نگرانی اور انتظام کی غرض سے ایک محکمہ جنگ قائم تھا جس کی چھ شاخیں تھیں۔ یعنی پیادہ و سوار فوج اور جنگی رتھوں اور فیل خانے وغیرہ کے انتظام کے لئے ایک ایک شاخ الگ بنا دی گئی تھی، اور ہر ایک میں پانچ پانچ عہدہ دار کام کرتے تھے؛

سلطنت کے مختلف صوبوں پر بالعموم شاہی خاندان کے افراد صوبہ دار مقرر کر دئے جاتے تھے اور پرچہ نویسوں کے ذریعے ان کی خبریں راجہ کو پہنچتی رہتی تھیں اور اگر مگاس تھنیر کا قول صحیح ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ صدر حکومت کی عمال و رعایا کے ہر طبقے پر کافی سے زیادہ نگرانی تھی اور جاسوسی کا

علاوہ کتاب ارتھ شارتر سے جس میں سلطنت کے تمام حکموں کے نام اور کام لکھے ہیں اس امر کی تصدیق نہیں ہوتی کہ محکمہ جنگ بھی کوئی علیحدہ محکمہ ہوتا تھا۔ دیکھو آستھہ صفحہ ۱۱۱

بہت بڑا محکمہ قائم تھا تو لیکن اس عہد کے لوگوں کی دماغی اور اخلاقی حالت کا شاید سب سے اچھا اندازہ جرائم اور سزائوں کا حال پڑھ کر ہو سکتا ہے اور ان کی خاصی تفصیل ارتھ شاستر اور مگاس تھنیز کے اجزا میں موجود ہے :-

یونانی سفیر لکھتا ہے کہ ہندوستان میں جرائم کا ارتکاب کم ہوتا ہے اور جب ہوتا ہے تو اس کی نہایت سخت و عبرت انگیز سزائیں دی جاتی ہیں۔ پینا پنچہ راجہ کی سواری نکلتے میں کسی قسم کا ہنگامہ کرنا، یا ادائے محصول سے پچنے کی کوشش بھی سنگین سزا کے لائق سمجھی جاتی ہے، بغاوت یا بادشاہ کے خلاف کسی قسم کی سازش سب سے بڑا جرم سمجھی جاتی تھی اور اس کے مجرم کو زندہ آگ میں جھونک دیتے تھے حتیٰ کہ برہمن بھی جنہیں سخت سے سخت جرم کی سزا میں صرف جلا وطن کرنا، جائز تھا مذکورہ بالا جرائم کی پاداش میں سزائے موت کے مستوجب سمجھے جاتے تھے اور اسی واقعے سے ہندوستان میں مطلق العنان بادشاہوں کا غیر معمولی مرتبہ ظاہر ہے کہ ان کی حفاظت کے لئے مذہب کے عزیز ترین اصول میں بھی استثنائے کر دیا گیا تھا، سرکاری ملازمین کا آٹھ دس پن چرائینا انہیں سزائے موت کا مستوجب

بنادینا تھا۔ اور وٹنٹ استھ کا قیاس ہے کہ پن چاندی کا سکہ ہونا تھا جس کی قیمت تقریباً ایک انگریزی شلنگ کے برابر سمجھنی چاہئے، اصولاً آنکھ کے بدلے آنکھ اور کان کے بدلے کان کا قانون رائج تھا لیکن بعض معمولی قصوروں پر بھی اعضا کی قطع و برید جائز سمجھی جاتی تھی اور ایک عجیب سزا = تھی کہ خاطر کی سرمنڈ وا دیا جائے۔ اس ”مجموعہ تعزیرات“ کا شاید سب سے خوفناک حصہ وہ ہے جس میں اقبال جرائم کے لئے ملزم کو اذیت پہنچانے کی اٹھارہ شکلیں بیان کی گئی ہیں۔

وسائل
آب پاشی

مگر مہاراجہ چندرگپت کے زمانے کی سب سے زیادہ قابل تعریف شے آب پاشی کے وسائل ہیں جن کا مختلف ذرائع سے اجمالی حال معلوم ہوا ہے۔ - تو یقین کے ساتھ کہنا مشکل ہے کہ چندرگپت یا اس کے کسی پیش رونے باقاعدہ نہریں کھدوائی ہوں گی۔ لیکن ارتھ شاستر میں ”آبیانے“ کی مختلف شرحیں اور مگاس تھنیز کے بعض اقوال سے ثابت ہوتا ہے کہ بارش کے علاوہ بہت سے کھتیوں کو ندی نالے

۱۔ اتنی سخت سزا کے باوجود ارتھ شاستر سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکاری ملازمین کی خیانت و رشوت ستانی کا کوئی اندازہ نہ ہو سکا تھا، کیونکہ بقول مصنف ”جس طرح = معلوم کرنا غیر ممکن ہے کہ پانی کے نیچے پھلی نے کتنا پانی پیا اسی طرح سرکاری عمال کی چوری پکڑنی بھی محال ہے“ ۱۲

تالاب یا اس قسم کے بند باندھ کر پانی دیا جاتا تھا جن پر سرکاری
نگرانی رہ سکتی تھی۔ کم سے کم ایسے ایک بند کا حال تو یقین
کے ساتھ ہمیں معلوم ہے جس کی سک (یا سکا Saka))
قوم کے ایک صوبہ دار نے دوسری صدی عیسوی میں مرمت
کرائی تھی۔ اس صوبہ دار کا جو کتبہ گرنار (علاقہ کاٹھیاوار) سے
برآمد ہوا ہے اس میں تحریر ہے کہ اس مقام پر سب سے
اول چندرگپت کے صوبہ دار نے بند باندھ کر بھیل کا پانی
روکا تھا لیکن اس بند کی تکمیل اشوک راجہ کے زمانے میں
ہوی اور وہ چار صدی تک اس علاقہ میں آب پاشی کا
ہنایت عمدہ وسیلہ رہا۔ مگر جب شہزادے کے سخت طوفان
میں بند ٹوٹا اور بھیل خالی رہ گئی تو اس وقت ازسرنو
اسے بنوایا اور مذکورہ بالا کتبہ کندہ کرایا گیا۔

اس واقعے سے نہ صرف سلطنت گدھ کی وسعت بلکہ
نظم و نسق کی بھی خوبی ثابت ہوتی ہے کہ موریا خاندان کے
راجہ اپنے دُور دراز کے صوبوں تک کی خبر رکھتے تھے اور
انہیں اپنی رعایا خاص کر کاشتکاروں کی سہولت و رفاه کا
بڑا خیال تھا۔ مالگزاروں کے قواعد و ضوابط ان کی انتظامی
قابلیت کے گواہ ہیں جنہیں مگاس تھنیز اور کتاب ارتھ شاستر
کے مصنف نے جتہ جتہ نقل کیا ہے۔

غرض چوبیس برس تک کمال شان و شوکت اور حشمت
و کامرانی کے ساتھ حکومت کر کے چندرگپت نے دنیا کی

ناپائیدار خوشیوں پر لات ماری اور سلطنت چھوڑ کر فقیر ہو گیا تو یہ بیان جینیوں کی ایک مذہبی روایت پر مبنی ہے۔ انہی کا قول ہے کہ یہ راجہ جین مت کا پیرو تھا اور اسی مت کے ایک گرو کے ساتھ جنوب کے جنگلوں میں بکل گیا تھا پھر وہیں (میسور کے علاقہ میں) اس نے فاتہ کشی کر کے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا تو یہ عبرت ناک واقعہ صحیح ہو یا نہ ہو، کم سے کم ہمیں قدیم ہندوستان کے حکما کے عقائد و افکار کا سراغ دیتا ہے کہ وہ دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت کو نہ صرف حقیر و ذلیل بلکہ قابلِ نفرین شے سمجھتے تھے اور ان کے نزدیک روح کی تمام آلائش و آلام کا سبب ہی جسمانی زندگی تھی جس کا خاتمہ کر دینا گویا روح کو عذاب الیم سے چھڑا دینا تھا۔

غرض خواہ چندرگپت نے اپنے پاپے سخت میں مرگِ طبعی سے وفات پائی ہو یا سلطنت سے دست بردار ہو کر چلا گیا ہو، اتنا قریب قریب یقینی ہے کہ اس کا دورِ حکومت مسیح قبل از ۲۹۰ ق م میں ختم ہو گیا اور اس کا بیٹا ریند سار بادشاہی کا وارث ہوا تو

اس عہد کے ہمیں اتنے حالات میسر نہیں آتے جتنے چندرگپت کے زمانے کے معلوم ہیں۔ اور مگاس تھنیز کے بعد جو یونانی سفیر دربارِ مگدھ میں آکر رہے ان کی تحریریں اب بالکل مفقود ہو گئی ہیں۔ البتہ اس بات کے قرائن موجود ہیں کہ اس راجہ نے جانبِ دکن سلطنت کو وسعت دی اور نربدا کی

بجائے تنگ بھدرا اور پیٹار نامی ندیوں سے بھی کچھ آگے
 بڑھ کر اس کی جنوبی سرحد قائم ہوئی ہے مگر یہ سب قیاسی
 باتیں ہیں اور بندسار کا نام اس وجہ سے اور بھی تاریکی میں
 چھپ گیا ہے کہ وہ اپنے سے زیادہ اقبال مند باپ کا
 بیٹا اور اس سے بھی زیادہ نامور بیٹے کا باپ تھا !

*

ملک تبت کے ایک مورخ (تاراناتھ) نے یہ روایت نقل کی ہے کہ
 بندسار نے مشرقی اور مغربی سمندروں کے درمیان تمام ملک فتح کر لیا
 تھا۔

باب ششم

پہلی فصل - عہد اشوک (۱)

راجہ بند سار کے بیٹے کی بھی اگرچہ باقاعدہ تاریخ نہیں لکھی گئی لیکن بہت سی باتیں صحت و یقین کے ساتھ معلوم ہیں اور اُس کے مشہور کتبات پڑھ کر یہ دھندھلی تصویر آنکھوں میں پھرنے لگتی ہے کہ درویشی لباس میں ایک بادشاہ مصروفِ فرماں روائی ہے! مگر اشوک نے ہوش آتے ہی یا تخت پر بیٹھتے ہی یہ زہد و تقویٰ اختیار نہیں کیا تھا بلکہ معلوم ہوتا ہے بارہ تیرہ برس تک اس کی بادشاہی کا رنگ وہی رہا جو دنیا کے اور طاقتور بادشاہوں کا ہوا کرتا ہے۔ اور اگر وہ ہاتھ جن سے اس نے سلطنت گدھ کا تاج اپنے سر پہ رکھا، بھائیوں کے خون سے لال نہیں ہوئے (جس کے متعلق قرآن کے سوا کوئی قابلِ سند تحریر نہیں ملتی) تو کم سے کم اُس کشت و خون کا جو ملکِ کلنگ میں ہوا اصلی مُلزم وہی ہے۔

خنج کلنگ

کہنے کو تو وہ اپنے باپ کے مرتے ہی تاج و تخت کا مالک ہو گیا تھا مگر تخت نشینی کی رسم چار سال بعد (۲۲۹) ملحق م میں

ادا ہوئی اور اسی وجہ سے اس قول کو تقویت پہنچتی ہے کہ گو باپ نے اُسے دلی عہد بنا دیا ہو لیکن دوسرے بھائی بھی تخت کے دعوے دار تھے اور یہ چار سال اپنی کے ساتھ جنگ و کشمکش میں گزرے۔ غرض تخت نشینی کے نوے برس بعد اشوک کا پہلا واقعہ جو ہمیں معلوم ہو سکا وہ ملک کلنگ پر فوج کشی ہے جہاں گدھ کے ہسائے میں خود مختار سلطنت قائم تھی۔ بلکہ مگاس تھنیز نے ہندوستان کی جن ریاستوں کا مجمل حال لکھا ہے ان میں فوجی قوت کے اعتبار سے گدھ کے بعد دوسرا نمبر کلنگ ہی کا سمجھنا چاہئے کیونکہ ریاست آندھ میں اگر پیادہ فوج اور ہاتھیوں کی تعداد زیادہ تھی تو سوار فوج کا شمار کلنگ کی نسبت ایک چوتھائی سے بھی کم تھا (دیکھو صفحہ ۸۲) بایں ہمہ یہ ریاست گدھ کا مقابلہ نہ کر سکی اور سخت کشت و خون کے بعد اشوک نے اسے فتح کر کے اپنی سلطنت کا صوبہ بنا لیا۔ اور اب گدھ میں پنیار پدی تک (موجودہ نیپال و افغانستان سمیت) تمام ہندوستان کا علاقہ داخل ہو گیا اور یہ اتنی بڑی سلطنت تھی کہ زمانہ تاریخی میں نہ پہلے کبھی یہاں قائم ہوئی تھی اور نہ آئندہ کسی ہندو راجہ کے نصیب میں آئی، لیکن فتح و کامرانی کی مسرت کے ساتھ صاحب فکر فاتح کے دل پر ان عظیم مصائب کا بڑا اثر ہوا جو ملک مغرب کے باشندوں کو برداشت کرنی پڑی تھیں اور اس کا

ایک ثبوت تو وہ کتبات ہیں جن میں مفتوحہ لک کے عمال کو بہ تاکید ہدایت کی ہے کہ رعایا پر کمال شفقت و انصاف کے ساتھ حکومت کریں، اور دوسرا ثبوت وہ اندرونی تغیر ہے جس نے فلاح کو آخر کار بودھ مت کا پیرو بنا دیا؟

کتبات

ان کتبات کی تعداد جو اب تک دستیاب ہوئے، ۳۴ ہے اور عجب نہیں کہ آئندہ بھی اس میں اضافہ ہوتا رہے۔ کیونکہ میسور سے ہمالیہ اور خلیج بنگال سے بحر عرب کے ساحلوں تک مختلف مقامات پر ان کا پتہ چلا ہے اور اتنے وسیع رقبے میں بہت ممکن ہے کہ بعض کتبے دھوئیلے والوں کی نظر سے چھپے رہے ہوں۔ مخفی رہنے یا ضائع ہو جانے کا ایک سبب یہ ہے کہ بعض کتبے پہاڑ کی چٹانوں پر کھدوا دئے گئے تھے اور بعض پتھر کے میناروں پر کندہ ملے ہیں، سینکڑوں کتبات کے اعتبار سے ان کی چار قسمیں کی جا سکتی ہیں:-

(۱) ”چٹان کے کتبات“ جن میں ”کلنگ کے

فرائین“ بھی شامل ہیں، ۲۵۰ء و ۲۵۰ء ق م میں کندہ ہوئے اور ان میں ”چٹان کے چوڑے فرائین“ سب سے زیادہ کار آمد ہیں جن میں اشوک نے اپنے مذہبی عقائد اور اصول حکومت کا ذکر کیا ہے اور اپنے عمال کو بھی انہی کے مطابق چلنے کی تاکید کی ہے۔

(۲) تین ”غاروں کے کتبے“ جو ضلع گجرات سے برآمد

ہوے ہیں اور جن کی تاریخ کتابت ۱۵۷۷ء اور ۱۵۸۰ء ق م ہے اشوک نے بہت سا روپیہ صرف کر کے ان غاروں میں قابل سکونت مکانات بنوا دئے تھے اور انہیں سنیا سیوں کے ایک فرقے کو دے دیا تھا جو بہ اعتبار عقائد بودھ مت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ لہذا ان مختصر کتبوں سے بھی اتنا پتہ چلتا ہے کہ بودھ مت کا نہایت پر جوش حامی ہونے کے باوجود اشوک دوسرے مذہب کے فقرا کا خیال رکھتا تھا؛

(۳) ”ترائی کے دو میناری کتبے“ جو ۱۲۴۹ء میں نصب کئے گئے تھے۔ یہ تحریریں اس بات کا ثبوت ہیں کہ راجہ اشوک نے واقعی نیپال کے ان علاقوں کا سفر کیا تھا جو بودھ مت والوں کے نزدیک گوتم کا مولد ہیں؛

(۴) ”میناری کتبات“ جو ۱۲۴۳ء سے ۱۲۴۷ء ق م تک کی یادگار ہیں۔ ان میں اول کے ساٹھ کتبوں کا مضمون وہی ہے جو پہلے چٹانوں پر کندہ کرایا گیا تھا یعنی وہی احکام زیادہ مفصل اور تاکید پیارے میں میناروں پر کندہ کرا دئے ہیں اور باقی تین چھوٹے میناروں کے کتبات میں بودھ مت کے اندرونی اختلافات کا ذکر ہے؛

یہ بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ یہ سب کتبے کسی ایک زبان میں لکھے ہوئے نہیں ہیں بلکہ جس ملک میں جو بولی یا پراکرت رائج تھی وہاں کے کتبے میں اسی سے

کام لیا گیا ہے۔ اور پیرائے بیان سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جب اشوک نے یہ مذہبی احکام و ہدایات کندہ کرائی ہیں، اس وقت ملک میں بودھ مت عام طور پر شایع ہو چکا تھا اور عوام الناس میں بہ کثرت اس کے ماننے یا کم سے کم جاننے والے موجود تھے۔ کتبات کے کندہ اور نصب کرانے کے واسطے وہی مقامات منتخب کئے گئے ہیں جو تیرتھ جاترا یا کسی عام شاہراہ پر واقع تھے۔

مینار اور دیگر
علاقت

اشوکی مینار یا لاٹھیں جن میں سے بعض پر کتبہ کندہ ہے اور بعض پر نہیں ہے، ہند کی قدیم سنگ تراشی کا بے بہا نمونہ ہیں۔ ان میں سے بعض کی بلندی پچاس فیٹ کے قریب ہے اور وہ سب پتھر کی ایک ڈال کو گول تراش کر بنائی گئی ہیں۔ اشوک نے ایسی بہت سی لاٹھیں جا بہ جا نصب کرا دی تھیں اور یہ اس کے ذوق تعمیر کی ادنیٰ یادگاریں ہیں ورنہ عام روایات میں اسے ہزاروں عمارتوں کا بانی قرار دیا گیا ہے جن میں شاہی محل، گنبد، خانقاہیں وغیرہ ہر قسم کے مکان شامل تھے۔ شان شوکت اور نقش و نگار کے اعتبار سے یہ بادشاہی عمارتیں صدیوں تک دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتی تھیں لیکن زمانے کی گردش نے آج ان کا کوئی نشان باقی نہیں چھوڑا اور اس عہد کے اگر آثار قدیمہ کہیں ہیں تو صرف قصبہ ساہی میں جو آجین سے تقریباً سو میل مشرق میں واقع ہے۔

ولیمہدی کے زمانے میں اشوک، اجین کا صوبہ دار تھا اور اس نے اسی علاقے میں شادی کر لی تھی پس قرینہ کہتا ہے کہ یہاں کی سب نہیں تو بعض عمارات ضرور اس کے حکم سے تعمیر ہوئی ہونگی پڑ

اشوک کی عمارات کے مہدم اور بے نشان ہو جانے کے باوجود، میناروں کے علاوہ، اس عہد کی سنگ تراشی کے بعض اور نمونے بھی باقی رہ گئے ہیں۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ اس فن کو ہندوستان میں سب سے اول اسی زمانہ میں فروغ ہوا۔ کیونکہ اشوک سے پہلے عمارات میں پتھر کا استعمال بہت کم ہوتا تھا اور جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے، تعمیر و آرایش کے لئے زیادہ تر لکڑی یا ہاتھی دانت سے کام لیتے تھے۔ مگر اشوک زیادہ دیرپا شے کا خواہاں تھا اور ہندوستانی کاریگروں میں بھی اس بات کی استفادہ موجود تھی کہ لکڑی کی بجائے پتھر پر اسی قسم کی صنعتی دکھا دیں۔ چنانچہ ”بہت سی جڑیائیاں ظاہر کرتی ہیں کہ یہاں کے سنگ تراش لکڑی اور دانت کے کاریگروں کی تقلید کرتے تھے“ اور گو اس فن میں ہندوستان والوں نے اہل ایران و یونان سے استفادہ کیا تھا تاہم اس وقت کے جو نمونے موجود ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ کم سے کم

سنگ تراشی

عہد اشوک میں ہندی کاریگر خود استاد فن ہو گئے تھے اور انہوں نے ہندوستانی سنگ تراشی کو ممالک غیر سے بالکل جداگانہ اور ممتاز بنا دیا تھا۔ چنانچہ بنارس کے قریب قصبہ سازناٹھ سے اور بعض دیگر مقامات سے سنگ تراشی کے جو نمونے دستیاب ہوئے ہیں، قدیم یونان و ایران میں ان کی نظیر ملنی دشوار ہے اور ہمارے زمانے کے ایک مبصر فن کی رائے میں ”باقاعدگی اور صحت تراش کے لحاظ سے ایتھنز کی عمارت کی بہترین دستکاری بھی ان سے بڑھ کر نہیں ہے“

دوسری فصل - عہد اشوک (۲)

مذکورہ بالا کتب و فراین سے اس ”دھم“ (دھرم) یعنی ”قانونِ فرائض“ کو سمجھنا آسان ہے جس پر اشوک اپنی رعایا کو چلانا چاہتا تھا۔ ”حقیقت یہ ”بودھ مت“ کے بڑے بڑے اصولوں کی عملی تعلیم تھی اور اس کے تین بنیادی عقائد تھے :- (۱) جیو رکھشا یا ”آہسا“ یعنی جانداروں کو مکلیف نہ دینا (۲) معلم، والدین اور بزرگوں کا ادب اور

(۲) راست گفتاری پڑ

تساخ اور ”کرم“ کا مسئلہ ہندوستان کے قریب قریب ہر قدیم مذہب میں کسی نہ کسی پیرائے میں تسلیم کیا گیا ہے۔ بودھ مت بھی روح کے وجود سے منکر ہونے کے باوجود ان کی صداقت کا قائل تھا اور چونکہ اس عقیدے کی رو سے ایک ذلیل کیڑا آئندہ کسی جوں میں دیوتا کے درجے تک ترقی کر سکتا ہے اس لئے ہر جاندار کی جان اسی قدر واجب احترام ہے جس قدر کہ انسان کی اور کسی جاندار کو آزار پہنچانا گویا گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنا ہے۔ حتیٰ کہ بودھ اور جین مت کے بعض فرماں رواؤں کو اس بارے میں یہاں تک غلو تھا کہ جانوروں کی جان کا آدمی کی جان سے بھی بڑھ کر احترام ملحوظ رکھتے تھے اور اشوک نے بھی جانور کو مارنے کی سزا ”دھموت“ رکھی تھی جیسا کہ اس کے میناری کتبے میں صراحت کے ساتھ مرقوم ہے پڑ اس میں شک نہیں کہ بودھ مت کا حلقہ بگوش ہونے سے پہلے جب وہ خوشخوار شیو کا پرستار تھا، تو اس کے دسترخوان پر بیسیوں قسم کا گوشت چُنا جاتا تھا اور شاہی ضیافتوں کے موقع پر سیکڑوں جانور مارے جاتے تھے لیکن رفت رفتہ یہ طریقہ بالکل موقوف ہو گیا اور شکار کی قدیم رسم شاہانہ بھی قطعاً ترک کر دی گئی (۱۵۹ء، ۱۵۷ء ق م) پھر ۳۲۳ء میں ایک مفصل قانون شائع کیا گیا جس کی ہر شخص کو خواہ

جو رکشا

وہ کسی مذہب و ملت کا ہو، پابندی لازمی تھی۔ اس قانون میں بعض جانوروں کو مارنے کی قطعاً ممانعت کر دی گئی تھی اور گوشت خواروں کو جن جانوروں کے کھانے کی اجازت دی گئی تھی ان کے متعلق بہت سی قیود بڑھا دی تھیں۔

ادب اور
سچائی

اس ”دھرم“ کا دوسرا اصول بزرگوں کی تعظیم و تکریم اور تیسرا راست گفتاری ہے جس پر اشوک اپنے فرامین میں بار بار زور دیتا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ ان اخلاقی فرائض کے واسطے سرکاری قواعد و ضوابط بنانا اتنا کار آمد نہیں ہو سکتا جتنا کہ خود لوگوں کا ان کی خوبیاں سمجھ کر ان پر عمل کرنا مفید ہے۔ چنانچہ اپنے آخری کتبے میں خود اشوک معترف ہے کہ یہ سرکاری قواعد محض لوگوں کی رہ نمائی کے واسطے بنائے گئے ہیں ورنہ عمدہ اخلاق اور نیکی اختیار کرنے کی بہترین سبیل یہ ہے کہ خود لوگ غور و فکر سے کام لیں تو لیکن واضح رہے کہ اشوک نے ان قوانین کو فقط کندہ کرا دینے پر اکتفا نہیں کی تھی بلکہ یہ بات تمام بڑے

اصحاب

میں یہ عجیب بات ہے کہ اشوک نے جن جانوروں کو مارنا ممنوع قرار دیا ہے ان میں گائے بیل اور سینگ والے جانور شامل نہیں ہیں اگرچہ اس سے پہلے ان جانوروں کو مارنے پر جرانے کی سزا دی جاتی تھی۔ لیکن اشوک نے اتنی سزا کو بھی اپنے قانون میں جائز نہیں رکھا تو

(دیکھو وی اسمتھ فنٹ نوٹ صفحہ ۱۷۷)

بڑے سرکاری عہدہ داروں کے فرائض میں داخل تھی کہ وہ مقررہ ایام میں اپنے مستقر پر اور جب دورے پر جائیں تو دیہات میں عام جلسے کر کے اپنے مانگزاروں اور زمینداروں کو ”دھم“ کی تعلیم اور قوانین شاہی کے مطابق عمل کرنے پر زور دیں۔ اس کے علاوہ ایک خاص محکمہ احتساب قائم کیا گیا تھا اور اس کے عہدہ داروں کا کام ہی یہ تھا کہ لوگوں کے افعال کی نگرانی کریں اور بلا لحاظ مذہب و حیثیت جو شخص مذکورہ بالا اصولوں کے خلاف چلے اسے سزا دلوائیں۔ تاریخ نویسی مواد اور کتابیں میسر نہ آنے کی وجہ سے یہ تو یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ بادشاہ کی ان کوششوں کا کیا نتیجہ ہوا اور اسے اپنے منشاء میں کس حد تک کامیابی نصیب ہوئی۔ لیکن مطلق العنان حکومت کا زور اور بادشاہ کو اپنے قانون کے راج کرنے میں جس قدر اہمک اور جوش تھا اسے دیکھ کر یہ بہ آسانی سمجھ میں آ سکتا ہے کہ کم سے کم عہد اشوک میں اہل ہند ان اخلاقی قواعد و ضوابط کے پابند تھے اور جو دل سے نہ مانتے ہوں وہ بھی ان کی ظاہری تعمیل پر مجبور تھے۔

اس مذہبی جوش کا اقتضا یہ تھا کہ ان کوششوں کو اپنی مملکت تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ گوتم بودھ کی ہدایت کے بہ موجب ممکن ہو تو ساری دنیا میں ”دھرم کا ڈنکا“ بجا دیا جائے۔ خاص اپنی رعایا میں اس اخلاقی تعلیم کو

پھیلانے کی جو تمہیں اشوک نے اختیار کی تھیں وہ سب اس کی ذہانت اور دماغی محنت کا نتیجہ تھیں اور غالباً پہلے کسی راجہ ہاراجہ نے اپنی سیاست و قوت کو ایسے مذہبی کاموں میں صرف کرنے کا ارادہ بھی نہ کیا ہوگا۔ اسی طرح بیرونی ممالک میں اپنے دین کی تبلیغ کرنے کا کسی ہندی کو سب سے پہلے خیال آیا تو وہ بھی گدھ کا مہی نامور بودھ راجہ ہے۔ اس کے واعظ تبت افغانستان اور شمالی دکن کی بعض خراج گزار ریاستوں میں گئے بلکہ انتہائے دکن اور لنکا تک پہنچے اور کتبوں کا اعتبار کیا جائے تو مصر و یونان کے بعید ممالک بھی اس تبلیغ کے دائرے سے باہر نہ رہے۔ لیکن اس آخری قول کی تصدیق میں جو دلیلیں پیش کی جاتی ہیں وہ کمزور ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اشوک کا یہ محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے جو غالباً اپنے مذہب کی شوکت نمائی کے لئے اس نے کتبات میں کندہ کرا دیا ہے۔

لنکا میں
کامیابی

بہر حال، اس کوشش میں سب سے بڑی کامیابی جزیرہ لنکا میں حاصل ہوئی جہاں اشوک نے خاص اپنے بھائی مہندر یا مہندا کو سرگروہ بنا کے بھیجا تھا۔ اس کے ساتھیوں کی تقریر اور ایسے طاقتور بادشاہ کے اثر سے

ع۔ ریس ڈیوڈ اس دعویٰ کی جن دلائل و قرائن سے تردید کرتے ہیں ان کے لئے

دیکھو ”پڑھت اٹریا“ صفحہ ۲۹۸ -

راجہ لنکا (ٹیسا) اور اس کے امیروں نے بودھ مت قبول کر لیا اور چند ہی سال میں یہ مذہب اس ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گیا۔ حتیٰ کہ اگر صحیح معنی میں کوئی قوم آج تک بودھ مت کی پیرو ہے تو وہ لنکا ہی کے سنگھالی ہیں جن کی تعداد اکیس لاکھ سے کچھ اوپر ہے؛ دیگر بعید ممالک میں اس تبلیغ و دعوت کا جو کچھ اثر ہوا ہو اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنا دشوار ہے اور خود یہی امر مشتبہ ہو گیا ہے کہ اشوک نے کون کون سے ملکوں میں دعا بھیجے تھے؛ البتہ یہ بات قریب قریب ہر محقق کو تسلیم ہے کہ بودھ مت کو محض ایک مقامی فرقے کی بجائے مذاہب عالم کی صفِ اول میں پہنچا دینے والا اشوک ہی ہے۔ اور ہندوستان کے باہر اس مذہب کے جس قدر نام لیوا پائے جاتے ہیں وہ سب گدھ کے اسی راجہ کے رہنِ مہمت ہیں جس نے غیر ملکوں میں تبلیغ و دعوت کی بنا ڈالی تھی اور اپنی زندگی ہی میں اس کام کو ایسے وسیع پیمانے پر شروع کر دیا تھا کہ بعد میں صدیوں تک اس کا اثر قائم اور وہ کام جاری رہا؛

تیسری فصل۔ اشوک کے ذاتی حالات اور جانشین

”اپنے مذہب اور اخلاقی نظام کی تعلیم کو پھیلا نے کی

جس شد و مد سے اشوک نے کوشش کی وہی اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ وہ اپنے مقصد کو سچا جانتا تھا اور اس لئے اپنی دین داری کا جو اظہار اس نے کتبات میں کیا ہے اُسے جدید اہل تحقیق درست سمجھیں تو بالکل بجا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ”لوگوں کی بھلائی کے واسطے کام کرنا میرا فرض ہے“ اور بے شبہ اُس نے یہ فرض ادا کیا۔ اس کے کاموں کا ثمرہ آج تک اہل دنیا کے سامنے ہے اور اس کے اقوال میں ’جو گم ہو گئے تھے اور اب پھر ان میں آواز بھری گئی ہے‘ صداقت و اخلاص کی گونج ہے؛

” اشوک نہایت مشقت پسند فرماں روا تھا۔ ہسپانیہ کے بادشاہ فلپ ثانی کی طرح کام کرنے سے کبھی نہ ٹھکتا اور ہر وقت اور ہر جگہ ملک کے حالات سننے کے لئے تیار رہتا تھا۔ اور پھر بھی اُسے اپنے کام سے سیری یا تشریح نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ خود شکایت کرتا ہے کہ ”مجھے اپنی محنت اور سرعت کار پر کبھی پوری طرح اطمینان نہیں ہوتا“ معلوم ہوتا ہے کہ اشوک ضرورت سے زیادہ محنت کرتا تھا اور عجب نہیں کہ اگر اتنی زیادہ درد سری نہ اٹھاتا تو زیادہ کام کر جاتا۔ مگر اس نے ادا سے فرض کا جو تصور اپنے ذہن میں قائم کیا وہ بہت بلند تھا۔ فلسفہ رواقیہ کے ماننے والوں کی طرح اسے اپنی فطرت کے احکام ماننے لازمی اور بلا لحاظ کامیابی و ناکامی محنت کئے جانا مقدر تھا؛

” x x x کتبات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اشوک راہبانہ پرہیزگاری کو شاہانہ دانائی کے ساتھ آمیز کر دینے کا متمنی تھا اور اپنی سمجھ کے مطابق ہندوستان میں ”حق کی سلطنت“ قائم کرنی چاہتا تھا۔ مگر یہ حق کی ایسی سلطنت تھی جس میں خدا کا نام تک نہ تھا اور اس کی بجائے لوگوں کو حق کے راستے پر سلطنت چلاتی تھی x x x“

اشوک کی دو بیویاں اور کئی بچے تھے مگر ان کے متعلق صرف غیر معتبر افسانے باقی رہ گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس اقبال مند راجہ کے بعد اس کے کسی بیٹے کے تخت نشین ہونے کی نوبت نہیں آئی بلکہ اس کے دو پوتے دسرتھ اور سامپتی تخت کے وارث ہوئے اور سلطنت گدھہ اشوک کے مرتے ہی کمزور اور کئی حصوں میں منقسم ہو گئی۔ اشوک کی وفات کا سال ۳۲۷ ق م کو قرار دیا گیا ہے اور اس کے بعد موریا خاندان کے اور چھ بادشاہوں کا پتہ چلتا ہے جو ۱۸۵ ق م تک گدھہ پر فرما رہے تھے۔ اس کے بعد موریا خاندان کی سلطنت صرف قریب کے علاقوں تک محدود رہ گئی تھی۔

بیویاں اور اولاد -

موریا خاندان کے زوال کے اسباب و واقعات کا مفصل حال معلوم نہیں۔ لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ

موریا خاندان کا خاتمہ

اس میں برہمنوں کی عداوت کو بہت کچھ دخل تھا۔ اشوک کے سخت قوانین سے لوگوں میں بد دلی پیدا کر دینا اور اس بد دلی سے فائدہ اٹھانا کچھ بید از قیاس نہیں ہے۔ بایں ہمہ سلطنت کو اصلی نقصان بیرونی حریفوں سے پہنچا اور دوسری صدی (ق م) کے اواخر میں کلنگ اور آندھر خاندان کے راجہ گدھ کی اطاعت سے آزاد ہو گئے۔ موریا خاندان کے آخری فرماں روا کو اس کے پہ سالار پشی متر نے دفا سے قتل کر ڈالا اور خود بادشاہ بن کر نئے خاندان شاہی کا بانی ہوا پتر (مشرق م) اشوک و چندرگپت کی اولاد میں بعض خاندان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے رئیس رہ گئے تھے اور ان کے نام کہیں کہیں ساتویں آٹھویں صدی عیسوی تک کے کتبوں میں موجود ہیں لیکن انہیں کبھی اتنا عروج حاصل نہیں ہوا کہ اپنے نامور خاندان کی عظمت کو دوبارہ تازہ کر دیتے پتر

*

باب ہفتم

پہلی فصل - سنگ، (کانو) اور آندھ خاندان

پشی متر ^{ملا} اور اس کی اولاد میں جتنے بادشاہ گدھ کے حکمران ہوئے، وہ سنگ (Sanga) خاندان سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ مگر ان میں سب سے عرصہ تک اور کامیابی کے ساتھ پشی متر ہی نے حکومت کی اور معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کے سوا تمام شمالی ہند کا علاقہ اس کے زیر نگیں آگیا تھا۔ اس راجہ کے آخری عہد حکومت میں کابل کے یونانی نژاد بادشاہ منادر نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ اور سندھ و گجرات، پنجاب و راجپوتانہ فتح کر کے جنوبی اودھ تک بڑھ آیا۔ (قیاساً شلہقم) ان یونانی یا نیم یونانی اور ایرانی بادشاہوں کا حال آگے آئے گا جو دوسری صدی قبل مسیح علیہ السلام سے تیسری صدی عیسوی

پشی متر

علا اس خاندان کے بعض ناموں کا آخری جز "متر" دلات کرتا ہے کہ غالباً یہ لوگ متر یعنی سورج دہتا کے پرستار اور ایرانی نسل سے تھے۔ اس بات کی اور شہادتیں بھی موجود ہیں کہ ہندوستان کے قدیم راجہ اہل ایران کے قردان تھے اور بعض ایرانی یہاں کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے۔ پس کیا عجب ہے کہ سپہ سالار پشی متر یا پشامتر بھی کوئی ایرانی نژاد سردار ہو؟

سنگ ہند کے بعض حصوں پر حکومت کرتے رہے۔ اس جگہ سلسلہ بیان درست رکھنے کے لئے اتنا لکھنا کافی ہے کہ کہ پٹی متر نے بہ مشکل مناندر کا حملہ روکا اور آخر حملہ آور اپنے شمالی مستقر کی جانب ہٹ گیا، اس خطرناک دشمن سے نجات حاصل کرنے کے بعد پٹی متر نے اشودھ کا جشن منانے کی تیاریاں کیں، اس کی نسبت خیال جاتا تھا کہ دنیا کا سب سے طاقتور بادشاہ ہی یہ رسم ادا کر سکتا ہے اور اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ ایک عمدہ نسل کے گھوڑے کو سال بھر کے واسطے آزاد چھوڑ دیتے تھے اور خود راجہ یا اُس کا کوئی نائب فوج لئے گھوڑے کے پیچھے پیچھے جاتا تھا کہ جس غیر ملک میں وہ جائے وہاں کے حکمرانوں کو زیر کرے۔ اسی طرح سال بھر تک اگر کامیابی ہوئی تو پھر وہ گھوڑا اور مغلوب فرماں روا دھوم دھام کے ساتھ پائے تخت میں لائے جاتے تھے اور وہاں فخر مند راجہ جشنِ عظیم برپا کرتا جس میں اُس گھوڑے کی قربانی کی جاتی تھی؛

پٹی متر نے اس غرض کے لئے جو گھوڑا چھوڑا تھا اس کے ساتھ اپنے پوتے بسو متر کو روانہ کیا تھا اور اسے صرف راجپوتانے کے مشرقی حصوں میں ایک لڑائی غالباً اُن سرداروں سے لڑنی پڑی جو مناندر کے بعد اس علاقے پر قابض ہو گئے تھے؛

غرض پٹی متر کی آرزو پوری ہو گئی اور اُس نے دھوم دھام کے ساتھ اشودھ کی رسم ادا کی ڈ

مگر اس واقعے سے پٹی متر کا سب سے طاقتور ہونا ثابت ہو یا نہ ہو، ایک بات کا ضرور سراغ لگتا ہے کہ اُس کے عہد میں برہمنوں کو دوبارہ فروغ ہوتا جاتا تھا کیونکہ اُنہی کے عقیدے میں اس قسم کی قربانیاں اُن دنوں جائز تھیں، بعض اور شہادتوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ پٹی متر نہ صرف قدیم برہمنی مت کا دل دادہ بلکہ بودھ مت کا سخت مخالف تھا اور اس نے ان پر ایسے ایسے ظلم کئے کہ بہت سے بھکشو گدھ سے بھاگ کر پنجاب میں چلے آئے ڈ

پٹی متر نے غالباً ۱۲۹ ق م میں وفات پائی اور اس کا بیٹا اگنی متر وارث تخت ہوا۔ مگر اس کے اور اس خاندان کے باقی پانچ راجاؤں کے نام ہی نام باقی ہیں اور قتل و خون کی بعض سازشوں کے سوا اس عہد کے کسی تاریخی واقعے کا پتہ نہیں چلتا۔ اسی قسم کی ایک سازش میں خاندان سنگ کے آخری فرماں روا کی جان گئی اور حکومت اس کے وزیر بسودیو (Vasu Deva) کے خاندان میں منتقل ہو گئی (۱۲۳ ق م) جسے کانو یا کانوائین کے نام سے موسوم کرتے ہیں ڈ

مگر یہ خاندان جس کے چار راجہ صرف ۴۵ سال تک حکومت کرتے رہے تاریخ میں کوئی شہرت نہیں رکھتا۔

برہمنوں کا فروغ

کانو خاندان

اس کے آغاز کے متعلق تو اتنا معلوم ہے کہ بسو دیو نے سنگ خاندان کے آخری راجہ کو قتل کر کے بادشاہی پر قبضہ کر لیا اور یا اس کے خاتمے کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس خاندان کے چوتھے راجہ کو دکن کے ایک (آندھری یا سات واٹن خاندان کے) فرماں روا نے (شاید ۱۷۷۰ء ق م میں) قتل کر دیا۔ ورنہ بیچ کے واقعات کا کچھ پتہ نہیں چلتا اور پرانوں کی بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس واقعے سے کہیں پہلے گدھ کے یہ راجہ اپنی خود مختاری کھو کر آندھروں کے باج گزار بن چکے تھے؟

آندھر خاندان کا
ابتدائی حال

مذکورہ بالا روایت کو جدید اہل تحقیق تسلیم نہیں کرتے لیکن یہ امر مسلم ہے کہ آندھر خاندان کی عرصہ دراز سے دکن میں حکومت قائم تھی اور مگاس تھنیز یونانی کے زمانے میں یہ ریاست سلطنت گدھ کے بعد ہند میں سب سے طاقتور مانی جاتی تھی۔ یہ خاندان دراوڑی نسل سے تھا اور اس قدیم زمانے میں گوداوری اور کرشنا کے دہانوں کے درمیان کا وڈ ملک (یعنی تلنگانہ) اس کا خاص علاقہ سمجھا جاتا تھا، جہاں اب بھی سب سے زیادہ دراوڑی زبانوں کا رواج ہے۔ اس ریاست کا قدیم پائے تخت ”سری کاکولم“ نامی شہر کو

۱۔ وی استھ۔ صفحہ ۲۰۶۔ گر ایک ہندو محقق مسٹر اینگر لکھتے ہیں کہ گدھ خاندان کے راجہ تلنگی زبان نہیں بولتے تھے۔ (رسالہ اینٹی اینٹی کوری، نومبر ۱۹۱۳ء)

بتایا گیا ہے جو کرشنا ندی کے کنارے آباد تھا؛
 مگاس تھنیز کی تحریریں دیکھ کر اس میں تو شبہ نہیں
 رہتا کہ یہ ریاست ان دنوں (یعنی چوتھی صدی ق م تک)
 خود مختار تھی لیکن اس کے ستر اسی برس بعد اشوک نے اپنے
 بعض کتبہات میں اس کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ گویا وہ سلطنت
 مگدھ کی باج گزار ہو گئی تھی۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ
 یہاں کے راجاؤں کی اندرونی خود مختاری میں زیادہ فرق نہیں
 آیا تاہم وہ چندرگپت یا اس کے بیٹے بندسار کے عہد میں
 مگدھ کی سیادت تسلیم کرنے لگے تھے اور عہد اشوک تک
 ان کی یہی حیثیت رہی؛ مگر اس اقبال مند راجہ نے وفات
 پائی تو جہاں سلطنت کے دور دست صوبے (خاص کر ریاست
 کلنگ) مگدھ کی اطاعت سے آزاد ہوئے وہاں آندھروں نے
 بھی اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا؛ بلکہ عجب نہیں کہ اشوک
 ہی کے آخری زمانے میں وہ اس کی اطاعت سے آزاد ہو گئے
 ہوں کیونکہ ان کے راجہ سموکا کی حکومت کا یہی زمانہ ہے اور
 وہ غالباً اپنی ریاست کا خود مختار بادشاہ تھا اور اسی کے
 جانشین راجہ کرشنا (یا کہتا) نے مغرب میں ساحل سمندر
 کے قریب تک تمام علاقہ فتح کر کے اپنی ریاست میں شامل
 کر لیا تھا؛

یہ تیسری صدی ق م کے واقعات ہیں اور ان کے
 بعد تقریباً دو صدی تک آندھروں کے حالات کا کچھ پتہ

غیر ملکی قبائل
 سے لڑائیاں

نہیں چلتا۔ ان کے تمام راجاؤں کے نام کی ایک لمبی فہرست ضرور مرتب کر لی گئی ہے لیکن ان میں بھی بہت سے نام شتبہ اور تاریخی واقعات بالکل مفقود ہیں۔ البتہ دو صدی بعد جب اس خاندان کے کسی راجہ نے گلدھ میں کانو خاندان کا خاتمہ کیا (سلسلہ ق م) اور اس کے سو برس بعد ان کی غیر ملکی قبائل سے لڑائیاں شروع ہوئیں تو پھر بعض واقعات تاریخ کی روشنی میں آئے ہیں:

بکٹریا (بانتر) پارتھیہ (گہستان یا خراسان) اور آخر میں سیتھیہ (یا ترکستان) کے بادشاہوں کے ہندوستان پر حملوں اور تسلط کا حال ہم کسی قدر تفصیل سے آئندہ پڑھیں گے۔ مناندہر کے وقت میں بلکہ اس سے بھی کچھ پہلے ان غیر ملکی اقوام کی ہند میں آمد شروع ہو گئی تھی اور وہ موجودہ گجرات، مغربی مالوہ اور احاطہ بمبئی کے بعض حصوں میں آباد ہونے لگے تھے اور پہلی صدی عیسوی میں آندھروں کی انہی کے حکمرانوں سے لڑائیاں ہوئیں۔ یہ حکمران ”ست راپ“ کہلاتے تھے (یہ صوبہ دار کے معنی میں قدیم ایرانی اصطلاح ہے) اور غالباً اول اول پارتھیہ پھر سیتھیہ کے اور آخر میں کچھ عرصہ تک کشان خاندان کے بادشاہوں سے ان کا محکومانہ تعلق تھا، انہی کا (جنوبی ممالک میں) دوسرا ست راپ جس کے حالات ہم تک پہنچے ہیں، نہپایاں (یا نہپاں) تھا۔ پہلی صدی عیسوی کے اواخر میں جنوبی راجپوتانے سے نارسک و پونا تک اور شمال مغرب میں گجرات کا

علاقہ اسی نہاپان کی قلمرو میں داخل تھا اور آندھر خاندان کے
تیسرے راجہ گوتمی پتربل باسے گڑ *Gautamiputra Vilivayukura*

کی قوت سے آزمائیاں اسی کے ساتھ شروع ہوئیں۔ یہ دکنی راجہ
ہندوؤں کا ایک قومی سورما مانا جاتا ہے اور اپنے عہد میں
”غیر ملکی مذاہب کی بیخ کنی کر دینے کا مدعی تھا۔ مگر معلوم ہوتا
ہے اُسے نہاپان کی زندگی میں کوئی نمایاں غلبہ حاصل نہ ہو سکا
البتہ جب وہ مر گیا تو اس کے جانشین راجہ بل باسے کر کے
حلموں کی تاب نہ لائے اور یہ جنوبی علاقہ (مہاراشٹر) ست راپوں
کے قبضے سے نکل کر آندھروں کی سلطنت میں شامل ہو گیا۔“
(۶۷۷ء)

دکن کے شمالی ممالک، یعنی مالوے میں ست راپوں
کا ایک اور خاندان حکومت کرتا تھا اور جنوبی حریفوں کے
مغلوب ہونے کے بعد آندھروں کی اُن سے لڑائیاں شروع
ہو گئیں۔ ان میں بل باسے کر کے جانشین کونا کامی نصیب
ہوی اور وہ علاقہ جو نہاپان کے ورثہ سے چھینا تھا، ہاتھ
سے نکل گیا۔ شمال کے اس حریف غالب کا نام رُدر دامن
(اول) ہے اور وہ ست راپوں کے شمالی خاندان کا تیسرا راجہ
یا فرماں روا تھا۔ مغربی ہند کے ان ست راپوں کا پائے تخت
آجین میں تھا اور اس وقت (دوسری صدی عیسوی) وہ
شمال مغربی ہند کے سیتھی یا کٹکان بادشاہوں کے باج گزار
تھے۔ ان کا کسی قدر تفصیلی حال ہم اگلی فصل میں پڑھیں گے

دھرم خاندان کا
خاتمہ

یہاں صرف آندھ خاندان کے حالات لکھنے مقصود ہیں جن کے سائیسویں راجہ جمن سری (Yajna Sri) نے مغربی ست راپوں سے دوبارہ جنگ چھیڑی اور غالباً بعض مغربی اضلاع چھین لئے۔ سگوں اور کتبات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عرصہ دراز تک (از ۱۱۷۰ء تا ۱۱۸۰ء) حکمران رہا اور آندھ خاندان کا آخری اقبال مند راجہ ہوا ہے کیونکہ اس کے بعد ان راجاؤں کی حکومت میں زوال آگیا اور ساڑھے چار صدی سے زیادہ عرصہ تک فرماں روائی کرنے کے بعد ان کے خاندان کا چراغ گل ہو گیا۔ انتزاع حکومت کے اسباب و واقعات بالکل تاریکی میں ہیں قیاساً اندرونی فساد کو ان کے زوال کا سبب مانا جائے یا بیرونی دشمنوں کے حملوں کو، یقینی طور پر جو کچھ کہہ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ۱۱۷۰ء سے اس خاندان کا نام گم ہے اور ان کے ملک میں آندھوں کے بجائے بیرونی اقوام کے چھوٹے چھوٹے سردار حکومت کرتے نظر آتے ہیں؛

دوسری فصل۔ ہند کے بانتری پارٹھی اور سیتھی حکمران

بانتری پارٹھی
کی خود مختاری

جس زمانے میں اقبال مند اشوک فرست و اطمینان سے اپنے اخلاقی قوانین کی ترویج میں مصروف تھا، اس کے

ہمسائے میں سخت خوزیری اور انقلابات ہو رہے تھے۔ ہماری مراد سلطنت ایران سے ہے جہاں ان دنوں سکندر کے سپہ سالار سلیوکوس کا پوتا وارث تخت ہوا تھا۔ اس بادشاہ (انتیاکوس) میں جو فرط غرور سے اپنے تئیں ”خداوند“ (تھیوس) کہواتا اور اپنی پرستش کرانا تھا، بادشاہی کی معمولی قابلیت بھی نہ تھی۔ اور اسی کے زمانے میں صوبہ بکٹریا اور پارٹھیہ نے خود مختاری کا علم بلند کیا۔ بکٹریا کا ایشیائی اور اصلی نام باختر ہے۔ یہ قدیم ایران کا سب سے زرخیز اور متمدن علاقہ تھا جس میں روایت عام کی بہ موجب ایک ہزار بستیاں تھیں۔ برخلاف اس کے پارٹھیہ وہ صحرائی اور کوہستانی ملک ہے جس میں موجودہ خراسان، سمرقند اور ہرات کے اضلاع داخل تھے، اور آسانی کے لئے ہم اسے ”خراسان“ کے جدید نام سے بھی یاد کر سکتے ہیں۔ اسی قوم کی زبان ”پارٹھوی“ بعد میں پہلوی کہلائی خود یہ لوگ فارس میں ”پہلوان“ کہلاتے تھے مگر فردوسی نے اس لفظ کو بہادر یا جنگ جو کے معنی میں اتنا عام کر دیا کہ اب اس کی اصلیت نگاہ سے مخفی ہو گئی ہے۔ غرض ان مختلف النوع صوبوں میں ایک ہی وقت بغاوت ہوئی (تقریباً ۳۰۰ ق م) اور دونوں شاہان سلیوکوس کے تسلط سے آزاد ہو گئے۔ مگر اس بات کو یاد رکھنا چاہئے۔ کہ باختر میں محض وہاں کا یونانی صوبہ دار موقع پا کر منحرف ہو گیا تھا اور پارٹھیہ کے جنگ جو شہسوار اشکان کے جھنڈے کے نیچے اس لئے

جمع ہوئے تھے کہ غیر ملکی حکومت کا جو اپنے کندھوں سے اتار کے پھینک دیں ؟

باختری کے یونانی
بادشاہ

اس طرح ملک باختری میں یونانی نسل کے بادشاہوں کی ایک علیحدہ سلطنت قائم ہو گئی (سنہ ۲۵۰ ق م) اور کوئی سوا سو برس تک ان کے افراد باختری، کابل اور نیز ہندوستان کے بعض اقطاع پر حکومت کرتے رہے۔ یہی آخری تعلق ہے جس کی وجہ سے ان کے حالات اس کتاب میں ہمیں لکھنے پڑے اگرچہ تاریخی اسناد میسر نہ آنے کے باعث ان میں سے بعض باتیں قیاسی ہیں، اتنا یقینی ہے کہ ان کے ایام خود مختاری میں ہند پر سب سے پہلے شام کے یونانی بادشاہ انتیا کوس اعظم نے فوج کشی کی تھی مگر غالباً افغانستان سے آگے بڑھنے کی نوبت نہ آئی اور وہ بہت جلد شام کی جانب واپس چلا گیا (سنہ ۳۰۰ ق م) واضح رہے کہ انتیا کوس باختری کے یونانی فرماں روا کا طیف اور رشتہ دار تھا اور شاید اسی کی امداد اور تحریک سے اُس نے یہ جرأت کی ورنہ خود اس کے ملک (شام) سے ہندوستان کو براہ راست کوئی تعلق نہ تھا اور ان میں جس قدر بُد ہے وہ ظاہر ہے ؟

شمالی مغربی
ہند کی فتح

انتیا کوس کے بعد باختری کے چوتھے بادشاہ دست ریوس نے ہندوستان پر فوج کشی کی اور غالباً سنہ ۱۹۰ ق م میں کابل کے علاوہ سندھ و پنجاب کے اضلاع فتح کر لئے۔ حملہ آوروں نے ان علاقوں کو بچانے والی کوئی بڑی قوت موجود نہ تھی کیونکہ مویا

خاندان کے راجہ زوال کی آخری منزلیں طے کر رہے تھے اور
عجب نہیں کہ ان بے حد صوبوں سے ان کا تسلط اٹھ چکا ہو؛
مگر دمت ریوس کے اتنی دور تک بڑھ آنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ
خود اس کے گھر یعنی باختر میں بعض سرداروں نے بغاوت کی
اور خود مختار بن بیٹھے۔ دمت ریوس کے پاس فقط ہند کے
مفتوحہ صوبے رہ گئے اور اسی لئے وہ یونانی تاریخوں میں
”شاہ ہندیاں“ کے نام سے مشہور ہے؛

اُس یونانی سردار کا نام یوک راتی دیں تھا جس نے
دمت ریوس کو باختر سے بے دخل کیا اور اس کی شجاعت و
جنگجوئی کی بڑی شہرت تھی۔ باختر پر قابض ہونے کے بعد یہ
ممكن نہ تھا کہ یوک راتی دیں اپنے پہلے آقا (دمت ریوس) کو
ہندوستان میں چین سے بیٹھنے دے۔ اس نے یہاں کے
مقبوضات کا دعویٰ کیا اور عرصے تک جد و جہد کرنے کے بعد
آخر کار ان علاقوں کو بھی چھین لیا۔ یہ شاید سلاسلہ ق م کا
واقعہ ہے؛

یوک راتی دیں کو خود اس کے بے رحم بیٹے نے قتل
کرا دیا اور پھر اپنے بھائیوں سے خانہ جنگی میں مصروف ہو گیا۔
اس واقعہ نے باختر کی نئی سلطنت میں سخت انتشار و فساد
برپا کر دئے۔ چنانچہ ہندوستان کے شمال مغربی صوبے سے
اُس زمانے کے بہت سے سکے دستیاب ہوئے ہیں جن سے
ظاہر ہوتا ہے کہ اس بد عملی میں بیسیوں یونانی سردار بادشاہی کے

دعویدار تھے اور جس کا جہاں زور چلتا تھا وہاں کا خود مختار
حاکم بن بیٹھتا تھا۔

تذعیان حکومت کے اس انبوه میں ناموری کا مستحق اگر
کوئی ہے تو وہ مناندر ہے جو غالباً یوک راتی دیس کا رشتہ دار
اور کابل کا بادشاہ تھا۔ ٹھیک ٹھیک سین کا تو پتہ نہیں چلتا
مگر اتنا ثابت ہے کہ وہ دوسری صدی ق م کے آخر اور
پہلی صدی کے آغاز میں فرماں روائی کرتا تھا۔ ونسٹ اسمتھ
کے قول کے بہ موجب ۵۵۰ ق م میں اس نے ہندوستان
پر وہ حملہ کیا جس کا مجمل ذکر ہم پہلے پڑھ آئے ہیں مگر محققین کا
ایک اور گروہ اس حملہ کو پندرہ بیس برس بعد کا واقعہ سمجھتا
ہے۔ بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ یہ حملہ نہایت کامیاب
ہوا اور سندھ و گجرات کو فتح کر کے مناندر نے قلعہ مدھی میکا
اور سا کے تم کا محاصرہ کر لیا (پہلا قلعہ آج کل ناگری کے نام
سے چتوڑ کے قریب موجود ہے اور دوسرا جنوبی اودھ میں واقع
تھا) پھر مناندر وہ ایسا موس ندی تک بڑھا یعنی شاید خاص
پائے تخت پائلی پترا تک پہنچ گیا تھا کیونکہ ”ایسا موس“ سے
غالباً دریائے ستون مراد ہے جسے یونانیوں نے اس طرح بگاڑا
ہے کہ اب اس کے اصلی نام کا پتہ نہیں چلتا، لیکن ایسے
شخص کا جس کے گھر میں بیسیوں رقیب و منفذ موجود ہوں

زیادہ عرصہ تک وطن سے باہر رہنا مخدوش تھا، مناندر کو بھی خانگی تنازعات کی وجہ سے واپس ہٹنا پڑا اور اس کی پسپائی میں ممکن ہے کہ پیشی متر کی جنگی کوششوں کو بھی کچھ دخل ہو؟

مگر مناندر کی شہرت کا ایک اور قوی سبب پالی زبان کی مشہور کتاب ”ملندا پان ہو“ ہوئی جس کا حال میں انگریزی ترجمہ بھی چھپ گیا ہے۔ اس میں مناندر کو ”ملندا“ کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور اس کی زبان سے بودھ مت کے متعلق بہت سے سوالات کرائے ہیں۔ اس کا مخاطب بودھ مت کا بھکشو ”ناگ سین“ ہے اور بودھوں کا قول ہے کہ اس بھکشو نے آفرکار مناندر کو قائل کر دیا اور وہ اسی مذہب کا پیرو بن گیا تھا۔ یہ روایت صحیح ہو یا غلط اس میں شک نہیں کہ مناندر منصف مزاج اور اپنی رعایا میں بہت ہر دل عزیز بادشاہ تھا اور اس کے بعد گو یونانی نسل و نام کے سردار شمال مغربی ہند کے علاقے میں کہیں کہیں فرماں روائی کرتے رہے لیکن انہیں کوئی خاص قوت حاصل نہ ہوئی اور ان میں سے اکثر شاہانِ پارٹھیہ یا سیتھی اقوام کے بان گزار بن گئے۔ کیونکہ پہلی صدی ق م کے شروع ہونے سے پہلے (۱۲۳ ق م کے قریب) باختر کی یونانی سلطنت کا چراغ گل ہو گیا تھا اور اب وہاں سیتھی حملہ آور قابض تھے۔

شاہان
پارتھیہ

یونانی نسل کے باختری بادشاہوں کی خانہ جنگی اور زوال کا زمانہ، پارتھیہ کی نئی حکومت کے فروغ و ترقی کا زمانہ تھا۔ افسوس ہے کہ ہماری عربی، فارسی تاریخوں میں ان پارتھی بادشاہوں کا بہت کم ذکر ہے اور سکندر اعظم کے بعد ساسانیوں تک کے تمام زمانے کو ”عہد ملوک طوائف“ کہہ کے ٹال دیا ہے جن میں ”اشکانیوں“ کو کسی قدر امتیاز حاصل ہوا، اصل یہ ہے کہ اشکانی بادشاہوں نے اپنے صوبہ داروں کو بہت کچھ آزادی دے رکھی تھی اور وہ اپنے مقام کے خود مختار فرماں روا معلوم ہوتے تھے ورنہ ساڑھے چار صدی سے بھی کچھ زیادہ عرصے تک ایران کی اصلی شاہنشاہی اسی خاندان میں رہی اور بعض بڑے نامور فرماں روا گزرے جنہوں نے عراق عرب تک تمام علاقہ یونانی تسلط سے آزاد کیا اور ہندوستان کے بعض حصے فتح کئے؛ ہندوستان کے ان صوبوں پر پارتھی صوبہ دار (یاست راب) مقرر اور ایک حد تک خود مختار تھے۔ اور ہماری تاریخ کا انہی نیم خود مختار صوبہ داروں سے تعلق ہے؛ مگر ان کے حالات کا مطالعہ کرتے وقت یہ ذہن نشین رہنا چاہئے کہ جو کچھ ہمیں معلوم ہو سکا اس کے ماخذ ناقص ہیں۔ شاہان پارتھیہ ہی کی کوئی مسلسل اور معتبر تاریخ موجود نہیں تو ان کے ہندوستانی ست راپوں کی کون لکھتا۔ پس بہت سی باتیں قیاسی اور مختلف فیہ ہیں؛

ہند کے پارتھی
حکمران

معلوم ہوتا ہے شاہان پارتھیہ نے شمال مغربی ہند میں

دو صوبے بنائے تھے: ایک میں ہرت و سیستان اور شاید بلوچستان کا ملک شامل تھا اور دوسرے میں شمال مغربی پنجاب یا قدیم ٹکلیلا کا علاقہ۔ ہمیں زیادہ تر اس دوسرے صوبے سے بحث کرنی چاہئے اور سلسلہ بیان کو ازیس کے زمانے سے شروع کرنا چاہئے جسے شاہ متراوتیس (ثانی) نے سیستان سے بدل کر ٹکلیلا بھیج دیا تھا (سنہ ۱۱۶ ق م) ازیس نے پارٹھیہ کے باج گزار بادشاہ کی حیثیت سے مغربی پنجاب میں بہت دن تک فرماں روائی کی مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں وہ خود مختار ہو گیا تھا، اس کے بعد کوئی سو برس تک اس کا بیٹا اور پوتا حکومت کرتے رہے اور غالباً سنہ ۱۱۲ میں ان سے گندوفاریس یا ہندوفاریس نے حکومت لے لی۔ اس شخص کے خاندان اور سلطنت پارٹھیہ سے تعلقات کا صحیح علم نہیں مگر اس قدر معلوم ہے کہ مغربی پنجاب کے علاوہ سندھ و ہرت پر بھی اس کا قبضہ تھا اور وہ تقریباً چالیس سال تک فرماں روا رہا، اس کے متعلق قدیم عیسائیوں میں یہ روایت مشہور تھی کہ جب مسیح علیہ السلام کے حواریوں نے دین مسیح کی تبلیغ کا ارادہ کیا تو سلطنت پارٹھیہ طامس ولی کے حصے میں آئی چنانچہ وہ گندوفاریس کے دربار میں بھی پہنچے اور وہیں کہیں کابل کے علاقے میں شہید ہوئے۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ جنوبی ہند میں آکے شہید ہوئے اور مدراس کے قریب میلاپور میں ان کے نام کی ایک درگاہ بھی بنی۔

ہوی ہے ؟

گندو فاریں کے بعد اس کا ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا اور ان میں سے صرف پنجاب کا حال معلوم ہے کہ اسے پہلی صدی کے وسط میں کشان خاندان کے بادشاہوں نے فتح کر کے اپنی سلطنت میں ملا لیا، اور غالباً سندھ و ہرات پر بھی یہی گزری۔ اس میں شک نہیں کہ جنوبی سندھ میں بہت بعد تک پارتھی رئیسوں کا فرما روا ہونا ثابت ہے مگر یہ بہت محدود ریاستوں کے حاکم تھے اور انہی کی طرح شمالی علاقوں میں یونانی بھی پہلی صدی عیسوی کے شروع تک کہیں کہیں حکومت کرتے نظر آتے ہیں ؟

سیتھی قوم
کی آمد

جیسا کہ ہم اشارہ کر آئے ہیں پہلی صدی عیسوی سے شمال مغربی ہند پر قبضہ سیتھی یا ترکمانی اقوام کے حملہ آوروں کو حاصل ہو گیا تھا اور ان میں سک یا سکا (Saka) پہلی قوم ہے جو سیستان و سندھ سے گزر کر غالباً گجرات کے علاقے میں پھیل گئی تھی (دوسری صدی ق م) ان کو اپنے وطن یعنی دادئی جیحون سے خانہ بدوش ترکمانوں کے ایک اور بڑے گروہ نے بے دخل کر دیا تھا جو یوچی Yuechi کے چینی نام سے مشہور ہے۔ یہ قوم اتنی بڑی تعداد میں شمال مشرق سے آئی تھی کہ نہ انہیں جیحون کے قبائل روک سکے نہ بانخر و پارتھیہ کے وہ بادشاہ جن کی نئی سلطنتوں کے حالات ہم اوپر پڑھ آئے ہیں۔ اور گو پارتھیہ میں نو وارد

یوچیوں کے قدم جمنے کی نوبت نہیں آئی لیکن سندھ و بانسہ سے یونانی حکومت کا نام و نشان مٹ گیا اور یہ خانہ بدوش وادی سیحوں کی زرخیز سرزمین کے مالک بن گئے۔ یہاں انہوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی اور اُن کے بڑے بڑے گروہ پانچ ریاستوں میں منقسم ہوئے جو پہلی صدی عیسوی کے آغاز تک موجود تھیں؛

شاید سترہ میں انہی گروہوں میں سے ایک گروہ گُشان یا کُسن (Kushan) کے سردار نے پانچوں ریاستوں پر قبضہ کر کے دوبارہ قوم یوچی کو ایک متحد سلطنت میں شیرازہ بند کر لیا اور کوہستان ہندوکش کو اتر کے ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ کتبوں میں اس بادشاہ کا نام دو کجلا کر کد فیس کہنے سے ہے مگر آسانی کی غرض سے اہل یورپ کد فیس کہنے لگے ہیں۔ ملک افغانستان کی فتح اسی سے منسوب کی جاتی ہے اور دریائے سندھ کے مغرب میں یونانی یا پارسی نسل کے رئیسوں کی جو ریاستیں باقی تھیں ان کا خاتمہ بھی اسی بادشاہ نے کیا، گو پنجاب اور ملک سندھ میں غالباً وہ کچھ اور مدت تک قائم رہیں؛

یوچی قوم کے اس نامور بادشاہ کے بعد اس کا بیٹا کد فیس دوم فرماں روا ہوا (۱۰۰ء یا ۱۰۵ء) اور وہ اپنے باپ سے بھی زیادہ بلند حوصلہ اور اقبال مند بادشاہ گزرا ہے۔ افسوس ہے کہ اس زمانے کے تاریخی واقعات پر تاریکی چھائی

کد فیس دوم

ہوی ہے اور قیاس آرائی کے لئے صرف پرانے کئے ملتے ہیں جن کی بنا پر بعض اہل الرائے کا خیال ہے کہ کد فیس دوم نے نہ صرف پنجاب بلکہ وادی گنگا میں بنارس تک اور جنوب میں زربلا تک تمام شمالی ہند کو فتح کر لیا تھا۔ اس خیال کو تقویت اس وجہ سے پہنچتی ہے کہ ان دنوں شمالی ہندوستان میں کسی ایسی قوی ریاست کا پتہ نہیں چلتا جو بیرونی دشمنوں کو روک لیتی۔ لہذا کد فیس کو اگر دوسری طرف سے اطمینان تھا اور اس کا باپ اندرونی طور پر سلطنت کو مستحکم اور کشان خاندان کے ماتحت قوم یوچی کو متحد کر گیا تھا، تو یہ بات خلاف عقل نہیں کہ اس کے جنگجو وارث کو اپنے کمزور ہمسائوں کے زرخیز علاقے لینے کا لالچ پیدا ہوا ہو اور جہاں تک آگے بڑھ سکتا تھا وہاں تک اس بے نظیر زمین پر قابض ہو گیا ہو۔ کیونکہ اس میں تو کچھ شک نہیں معلوم ہوتا ہے کہ کد فیس دوم کو ایسی فتوحات کی بہت فرصت حاصل تھی اور وہ تیس پینتیس برس تک حکمران رہا۔

منفرد ستاپ

کد فیس دوم کی یورش کے وقت شمالی ہندوستان میں کئی جگہ غیر ملکی ست راپوں کی حکومت تھی۔ ان میں سے بعض کے نام پارتھی ہیں لیکن وہ بالعموم سک یا سکا قوم کے لوگ تھے اور اس قوم کی نسبت ہم پہلے پڑھ چکے ہیں کہ یوچیوں نے اسے وادی سیحون سے نکال دیا تھا اور اس کے بعض گروہ سندھ کے راستے گجرات و مالوے میں

داخل ہو گئے تھے۔ اہل تحقیق کا خیال ہے کہ انہی کی مغربی ہند میں وہ حکومتیں قائم ہوئیں جن کی آندھرا خاندان کے راجاؤں سے جنگ و جدال کا حال ہم پچھلی فصل میں پڑھ آئے ہیں۔ لیکن اس قوم کا اصلی مستقر ہند کے باہر ملک سیستان ہی میں رہا بلکہ خود یہ نام (”سکتانی“ پھر ”سکستان“ سے سیستان) انہیں کی یادگار ہے۔ ہندوستان میں ان کی رسائی دوسری صدی ق م کے آخری سنین میں ہوئی تھی مگر ان کے مغربی صوبہ داروں کا ذکر دو صدی بعد سے شروع ہوتا ہے جب کہ پہلی صدی عیسوی کے اواخر میں ایتھین کا فرماں روا چشتن (Chashtana) اور مہاراشٹر یا جنوبی صوبے کا پہلا حاکم بھومگا تھا۔ ان کا پتہ صرف ان کے سکوں سے چلتا ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ شاید اس وقت تک یہ سب راپ حکومت سیستان کے محض ماتحت صوبہ دار تھے اور کدھیس دوم کے زمانے میں سلطنت کشان کے باج گزار بن کر اپنے نام کا سکہ ضرب کرانے لگے ان میں سے بعض کے نام پارتھی ہیں اور اس سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ سیستان اور قوم سکا کے دیگر مقبوضات شاہانِ پارتھیہ کے زیر اثر آگئے ہوں گے اور یا ان کی ہندی نو آبادیوں میں پارتھی عنصر داخل ہو گیا ہوگا؟

بہر حال، شاہانِ کشان کے باج گزار ہونے کے باوجود

مالوے کے ست راپوں نے بڑا عروج پایا اور جنوبی ست راپوں کا علاقہ بھی آندھروں سے چھین کر اپنے قبضے میں لے لیا (دیکھو صفحہ ۱۱۶) یہ دوسری صدی عیسوی کا واقعہ ہے اور اس وقت تیسرے ست راپ یعنی (بائی خاندان چشتن کا پوتہ) رُدر دامن (اول) مالوے کا فرما روا تھا؛ اس فتح نے اسے سندھ سے کوکن تک تمام مغربی ہند کا مالک بنا دیا اور اسی بنا پر اُجین کے یہ حاکم ”مغربی ست راپوں“ کے نام سے تاریخ میں مشہور ہوئے؛

ان کا خاتمہ

ان غیر ملکی بادشاہوں نے تین صدی تک بادشاہی کی اور سلطنت کشان میں زوال آنے کے بعد وہ بالکل خود مختار ہو گئے تھے۔ ان کا پائے تخت اُجین علم و فن اور صنعت و تجارت کا پہلے سے مرکز تھا غالباً ان ست راپوں کے عہد میں اسے اور بھی فروغ حاصل ہوا اور قرائن کہتے ہیں کہ بودھ مت کے خلاف انہوں نے برہمنوں کی حمایت اور سنسکرت علم ادب کی بھی سرپرستی کی۔ مگر یہ سب قیاسات ہیں اور ان کے ناموں کے سوا اور حالات معلوم کرنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ حتیٰ کہ یقین کے ساتھ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی حکومت کا خاتمہ کس طرح ہوا کتاب ”ہرش چرت“ میں ایک عجیب روایت تحریر ہے کہ آخری ست راپ (جس کا نام رُدر سنگھ Rudrasinha تھا) کسی اور شخص کی بیوی پر فریفتہ ہوا اور بھیس بدل کر پائلی پترا

پہنچا۔ گدھ کے راجہ سدرگپت کو جس کی ان ست راپوں سے جنگ ٹھنی ہوئی تھی، یہ حال کھل گیا اور اُس نے وہیں دھوکے سے اپنے دشمن کا کام تمام کر دیا۔ اور گوانسانہ ننگار کی یہ روایت قابل یقین نہیں لیکن یہ واقعہ صحیح ہے کہ مغربی ست راپوں کی حکومت کا راجہ سدرگپت نے خاتمہ کیا اور ان کا تمام علاقہ چھین کر اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ سدرگپت کا تفصیلی حال اگلے باب میں ہماری نظر سے گزرے گا مگر یہ فتوحات اسے چوتھی صدی کے اواخر میں حاصل ہوئی تھیں اور سکوں سے بھی ۳۵۰ء کے بعد مغربی ست راپوں کا نام و نشان غائب ہے پُر

تیسری فصل - راجہ کنیشک

چشتن کی مالوے میں حکومت کا زمانہ ٹھیک وہ زمانہ ہے جب کہ کدنیس دوم شمالی ہند پر فاتحانہ حملے کر رہا تھا۔ ان علاقوں میں سکا قوم کے بعض چھوٹے چھوٹے صوبہ داروں کا اس کے ہاتھوں مغلوب ہونا ثابت ہے اور یہ صوبہ دار یا تو اس کے باج گزار ہو گئے اور یا انہیں شاہانِ یوچی (یا کشتان) کے مقرر کردہ صوبہ داروں کے واسطے جگہ خالی کرنی پڑی۔ چنانچہ کشمیر، وسط پنجاب اور متھرا میں یہی ہوا کہ پہلی صدی عیسوی

کے دوسرے نصف میں سکا حکمرانوں کی جگہ یوچی سردار حکومت کرنے لگے جنہیں کدنیس دوم نے مقرر کیا تھا۔ شاید انہیں سرداروں میں کنیشک (Kanishka) بھی تھا جو یوچیوں کے ایک دوسرے گروہ میں شامل ہے اور کدنیس یا اس کے گروہ کا کوئی قریبی رشتہ دار نہ تھا۔

وسعت سلطنت

اس کے سکتے جو کابل سے غازی پور تک مختلف مقامات میں ملے ہیں ظاہر کرتے ہیں کہ غالباً وہ کدنیس دوم ہی کے زمانے سے اپنے نام کا سکہ ضرب کرانے کا اختیار رکھتا تھا اور ان دونوں کے ایک ہی وقت کے سکوں سے اہل تحقیق میں سخت اختلاف پیدا ہو گیا ہے کہ آیا کنیشک پہلے گزرا ہے یا کدنیس۔ مگر محققین کا اب اس بات پر اجماع ہوتا جاتا ہے کہ کنیشک کدنیس دوم کا جانشین ہے اور ۱۲۷ء کے قریب تمام سلطنت کشان کا بادشاہ ہو گیا تھا۔ اس کی تخت نشینی اور نشین کے متعلق اس قدر اختلافات ہیں تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ دیگر

۱۔ ان تمام واقعات کی صحت میں بہت سے شکوک اور اختلافات ہیں مگر ہم نے دستخط ہتھ کی تازہ ترین کتاب کی پیروی کی ہے ۱۲

۲۔ اوکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۱۲۷ء پر لیکن اُس کی تخت نشینی کدنیس دوم کی وفات کے کوئی دس برس بعد ہوئی۔ اور جس طرح اس انتقال حکومت کے اسباب معلوم نہیں اسی طرح اس پہچ کے زمانے کا بھی ہمیں کچھ علم نہیں کہ اس میں حکومت کس کے پاس رہی ؟

واقعات کی صحت کا کیا حال ہوگا؟ چنانچہ اب تک ٹھیک ٹھیک پتہ نہیں چل سکا کہ اس کی حدود سلطنت کیا تھیں۔ قیاس غالب یہ ہے کہ شمالی سندھ و کشمیر کو اس نے فتح کیا اور شرق میں پاٹلی پترا تک بڑھا۔ مغربی ست راپ بھی اس کے مطیع ہو گئے تھے اور اس اعتبار سے وہ قریب قریب نصف ہندوستان کا فرماں روا تھا جس میں اس بڑے اعظم کے بہترین حاکم شامل تھے؛ شمال میں موجودہ دولت افغانستان کا تمام علاقہ یوچیوں کے قبضے میں تھا اور (کاشغر، قتن اور یارقند کو کنشک نے فتح کر کے اپنی سلطنت میں ملا لیا تھا۔ یہ علاقے چین کے باج گزار تھے اور ان کی فتح میں اس قدیم سلطنت سے بھی لڑائیاں پیش آئیں کہ نہیں، دوم چینیوں کے ہاتھ سے سخت شکست کھا چکا تھا مگر کنشک ان کے مقابلے میں کامیاب ہوا اور چند چینی سردار یہ غمال میں لے کر آیا (۱۵۲ء) یہ سردار گرمیوں میں بودھ مت کی ایک خانقاہ واقع کافرستان میں رکھے جاتے تھے اور وہاں کے بھکشوؤں نے خانقاہ کی دیواروں پر ان کی تصویریں بنائی تھیں، بلکہ ساتویں صدی میں ہونین چوئنگ یا ہیوں تسانگ سیاح یہاں پہنچا تو اس وقت بھی ان چینی نظر بندوں کی یادگاریں موجود تھیں اور اہل خانقاہ ان کے حالات سناتے تھے؛

بودھ مت

علاقہ گندھار میں پرش پور یعنی موجودہ پشاور کنشک کا پائے تخت تھا۔ وہاں اس نے بودھ مت والوں کے واسطے عالی شان مذہبی عمارت بنائی تھیں جن کے کھنڈروں سے حال میں بعض کار آمد اشیاء دستیاب ہوئی ہیں۔ اس کے بودھ مت اختیار کرنے کے متعلق بہت سی روایتیں ہیں اور گو ان میں واقعات کو نہایت مبالغہ آمیز طریق پر بیان کیا گیا ہے لیکن اتنا مستم ہے کہ ہمارا جہ اشوک کے بعد ہندوستان میں اس مذہب کا سب سے بڑا حامی اور سرپرست کشان خاندان کا یہی راجہ کنشک گزرا ہے اور اسی نے بودھ مت کے بڑے بڑے علماء کی ایک مجلسِ عظیم کشمیر میں منعقد کی تھی۔ مشہور ہے کہ اس قسم کی پہلی مجلس اشوک کے ایما سے پانٹی پٹر میں ہوئی اور شاید اسی کی تقلید میں کنشک کو یہ خیال آیا تھا کہ اس مجلس کو سیاسیات سے کوئی تعلق نہ تھا مگر اس کے مذہبی مباحث کا مجموعہ ("جہاؤ بھاشا") علمائے تاریخ کے لئے بہت کام کی چیز ہے

مذہب و معلوم نہیں کیا اسباب تھے کہ کنشک بودھ مت کی اتنی حمایت کرتا تھا۔ اس مذہب کی کتابوں میں جو وجہ بیان کی گئی ہے وہ کچھ دل کو نہیں لگتیں بلکہ ایسا نظر آتا ہے کہ ہمارا جہ اشوک کے بودھ مت قبول کرنے کے متعلق جو کہانیاں مشہور تھیں گویا ان کو ذرا بدل کر کنشک سے منسوب کر دیا ہے۔ حالانکہ سکوں سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بادشاہ قدیم ایرانی، یونانی اور زرتشتی دیوتاؤں کے ایک عجیب مجموعے کا پرستار تھا اور معبودوں کے اسی گروہ میں اس نے بعض ہندی دیوتا بھی شامل کر لئے تھے۔ (اکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۱۳۱)

مذہب - چینی زبان میں محفوظ ہے ۱۱ منہ

اگرچہ اس سے ابھی تک خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا گیا، علمائے بودھ کے ان مناظروں سے اُس تعجب انگیز انقلاب کا پتہ چلتا ہے جو بودھ مت میں چار پانچ صدی کے اندر پیدا ہو گیا تھا۔ ضمناً لوگوں کے دماغی اور اخلاقی حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے؛ پہلا اور بہت بڑا فرق تو یہ ہے کہ بودھ مت میں اب بت پرستی کا رواج ہو گیا تھا اور بہت سے بتوں کے ساتھ خود بائی مذہب کی صورت بچنے لگی تھی۔ تین صدی پہلے کسی بودھ عالم کو یہ خیال بھی نہ آتا ہوگا کہ اپنے رہ نما گوتم کی پرستش کرے لیکن اسی تھوڑے سے زمانے میں ہندوستان پر بیرونی حملوں نے یہ اثر ڈالا کہ بودھ مت کے پیرو گوتم منی کو خدای صفت سے موصوف جاننے لگے۔ وہ نہ صرف اس سے اپنی مرادیں مانگتے بلکہ اس کی درگاہ تک دعا کی رسائی کے واسطے بھی اور اوتاروں (یا ”بُدھ ستوؤں“) کی شفاعت چاہتے تھے؛ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا، اس انقلاب کا بڑا سبب یہ تھا کہ وحشی یا نیم وحشی حملہ آوروں نے شمال مغربی ہندوستان کو فتح کیا اور یہاں بس گئے تو گو انہوں نے بودھ مت کو اختیار کر لیا لیکن ساتھ ہی ان کے قومی عقائد و اوہام کی بھی اس مذہب میں آمیزش ہو گئی اور چونکہ وہ صاحب حکومت و قوت تھے لہذا قرینہ کہتا ہے کہ علمائے بودھ اس خرابی کو نہ روک سکے۔ دوسرے خود ان میں بہت سے اندرونی اختلافات اور ملحدانہ خیالات پیدا ہو گئے تھے، اور کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ

✓
بوعہرتی اور
اندرونی اختلافات

گوتم بدھ کی اصلی تعلیم کیا ہے ؟ بلکہ انہی اختلافات اور متضاد خیالات سے گھبرا کر کنشک نے اپنے دینی معلم پارسو (Parsva) سے تھریک کی تھی کہ بودھ مت کے تمام علما کو جمع کیا جائے تاکہ بحث و مشورے کے بعد مذہب کے وہ اصول قرار دئے جاسکیں جو مسلم و شفق علیہ ہوں۔ ان دو پانچ سو منتخب علماء ” کی محنت و عرق ریزی کا نتیجہ وہ بیسٹ شرح ہے جسے ”ہماو بھاشا“ کہتے ہیں اور جس میں تمام اختلافات کا مفصل بیان قلم بند کیا ہے اور اٹھارہ بڑے بڑے فرقوں کے اختلافات رفع کئے ہیں۔ بایں ہمہ بعض اصولی فرق باقی رہ گئے اور اس مذہب کے دو بڑے گروہ اب تک موجود ہیں جن میں ایک ”ہینایانی“ (یعنی دور صغریٰ) یا قدیم تر عقائد کا پیرو کہلاتا ہے اور دوسرے کو ”ہمایانی“ (یعنی دور کبریٰ والے) کہتے ہیں ؛

کنشک نے غالباً ۴۰ برس حکومت کی اور ۱۶۲ء میں فوت ہوا۔ اس کی موت کے متعلق ایک عجیب قصہ مشہور ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید رعایا نے اس کی ہوس ملک گیری سے تنگ آکر اُسے مار ڈالا تھا ؛ واقعات تاریخی کے نہ ملنے کی وجہ سے یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس بادشاہ کا جانشین کون تھا۔ لیکن قرآن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے بعد اُسی کا بیٹا ہوشک Huvishka بادشاہ ہوا جس کے بہت سے سکتے دستیاب ہوئے ہیں ؛ اس کے پست سالہ عہد حکومت میں سلطنت کشان اپنے عروج پر تھی لیکن

کنشک کی وفات اور جانشینوں

زوال کا وقت بھی قریب آگیا تھا اور اگلے بادشاہ کے طولانی
 زمانہ حکومت میں اس کا شیرازہ بکھر نے لگا۔ یہ بادشاہ جس کا
 نام (باس دیو Vasudeva) ثابت کرتا ہے کہ اب
 یہ نو وارد یوچی خالص ہندوستانی ہو گئے تھے، شاید ۱۲۰۰ء
 سے ۲۲۰ء تک فرماں روا رہا اور اس کے بعد سلطنت
 مختلف ریاستوں میں منقسم ہو گئی۔ اس میں شک نہیں کہ
 پنجاب و کابل میں کشان (یا "شاہی") خاندان کے بادشاہ چوتھی
 صدی کے اخیر تک حکومت کرتے رہے اور ان کا خاتمہ
 گورے ہونوں (White Huns) کے سیلاب نے کیا لیکن
 باس دیو کے بعد ان کی قوت میں ضعف آگیا تھا اور گمان
 غالب یہ ہے کہ وہ تھوڑے ہی عرصے بعد ایران کے ساسانی
 بادشاہوں کے خراج گزار ہو گئے تھے۔ ایران میں یہ (ساسانی)
 خاندان پارتھیوں کا جانشین ہوا تھا اور اس کے اولوالعزم بادشاہوں
 نے "عہد کیانی" کی یاد تازہ کر دی تھی۔ تیسری صدی میں ان کے
 بادشاہ بہرام کے ہند پر حملوں کا پتہ چلتا ہے مگر تفصیلی حالات
 موجود نہیں اور بعد میں صرف دو واقعے مذکورہ بالا قیاس کی تائید
 کرتے ہیں، ایک تو یہ کہ ہرزد ثانی کو شاہ کابل نے اپنی بیٹی بیاہ
 دی تھی اور دوسرے یہ کہ جب شاپور ثانی نے ۲۲۰ء میں قلعہ
 دیار بکر پر رومیوں کو شکست دی تو ہندوستان کے ہاتھی اور
 کشان خاندان کا راجہ اس کے ساتھ تھے؛
 مگر جہاں تک شمالی ہندوستان کا تعلق ہے، چوتھی صدی کے

آغاز تک اس ملک کی تاریخ بالکل معدوم ہے۔ کوئی کتبہ کوئی
سکہ ایسا نہیں ملتا جو اُس زمانے کا سراغ دے؛ اتنا کہہ سکتے
ہیں کہ اس وقت یہاں کوئی بڑی سلطنت نہ تھی اور ایشیائی
دستور کے مطابق بہت سی خود مختار ریاستیں قائم ہو گئی ہوں گی۔
ورنہ مغربی ست راہوں کے سوا اس تمام مدت میں شمالی ہند
اور دکن کے کسی فرمانروا کا پتہ نہیں چلتا؛

ضمیمہ باب ہفتم

غیر اقوام کا اثر ہندوستان میں

ونسنٹ اسمتھ نے متو کے دھرم شاستر کی تدوین اسی (دوسری صدی ق م تا دوسری صدی عیسوی کے) زمانے سے منسوب کی ہے لیکن سنسکرت علم ادب کے بعض ماہرین کے نزدیک وہ تین سو برس بعد کی کتاب ہے (انسانی کلو، ج ۲۲ ص ۱۷۵) البتہ یہ قریب قریب مسلم ہے کہ بودھ مت کے تین مشہور مصنف (ناگارجون، اسوگوش اور بسومترا) راجہ کنشک کے عہد میں ہوئے ہیں اور چرک (Charaka) نامی طبیب بھی اس کی سرکار کا ملازم تھا جو قدیم ہندی طب کا سب سے مشہور مصنف مانا جاتا ہے۔ بعض اہل تحقیق کا گمان ہے کہ عجب نہیں اس نے حکیم بقراط یونانی کی طبی تصانیف سے استفادہ کیا ہو کیونکہ اُن دنوں شمال مغربی ہندوستان کی بعض ریاستوں میں جہاں یونانی نسل کے افراد حکمراں تھے، یونانی زبان کے جاننے والے ضرور موجود ہوں گے۔ لیکن یہ سب قیاسات ہیں اور ان کا

کوئی قابل لحاظ تھوری ثبوت نہیں ملتا۔

البتہ اس زمانے کے جوہت مکسیلا یا پشاور کے کھنڈروں سے برآمد ہوئے وہ زبانِ حال سے گواہی دیتے ہیں کہ اس فن پر یونانیوں کا بڑا اثر پڑا تھا چنانچہ گوتم بودھ کے بعض مجتھے یونانیوں کے آپلو دیوتا سے مشابہ ہیں اور بعض کی وضع زئیس دیوتا سے ملتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ پہلی صدی عیسوی کے اخیر میں جب شام اور ایشیائے کوچک پر رومیوں کا مستقل قبضہ ہو گیا اور یونانی ملوک طوائف کی خانہ جنگیوں سے نجات ملی تو وہاں یونانی علم و فن اور صنعت و حرفت کو بڑی ترقی ہوئی اسی آخری دور کے سنگ تراش تھے جن کی صنّاعی کے نمونے ایران و خراسان ہو کر ہند میں پہنچے۔ خاص کر کنشک اور اس کے بیٹے ہوشنگ کے عہد حکومت میں ان بیرونی کاریگروں کا اثر بہت نمایاں ہے اور ہندی سنگوں پر بھی یونانی دیوتاؤں کی تصویریں ملتی ہیں۔ سب سے عجیب بات یہ ہے کہ گو ان گُشان بادشاہوں کی زبان ایران کی قدیم بولی سے قریبی تعلق رکھتی تھی تاہم سنگوں پر اپنے نام یا اپنی زبان کے الفاظ وہ یونانی حروف ہی میں کندہ کراتے تھے۔ اسی ضمن میں یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ایک کتبے سے ثابت ہوا ہے کہ راجہ کنشک نے رومت الگبری کے بادشاہوں کا لقب (وو قیصر) (

اختیار کر لیا تھا۔

ایشیا کے ان مغربی ملکوں کا ہند پر جو کچھ اثر پڑا اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ شاہانِ کشان اور نیز یہاں کے یونانی نژاد رئیسوں کا ترکستان و خراسان سے آئے دن سابقہ پڑتا رہتا تھا۔ مگر دوسرا قوی سبب بیرونی تجارت کو سمجھنا چاہئے جو ان دنوں فروغ پر تھی۔ صحراے شام کا قدیم شہر پامیرا ہندوستان کی تجارت کا سب سے بڑا مرکز تھا اور یہاں سے کئی راستے (ایران ہو کر) شمال مغربی ہند کو آتے تھے، بلکہ ملک چین کا تجارتی مال بھی انہی ہندوستانی راستوں سے ایشیا کو چک پہنچتا تھا۔

ان بڑی راستوں کے علاوہ سمندر سے بھی تجارت کا مال آتا جاتا تھا۔ بحر عرب سے مغربی باد برشکال یا "مونسون" کے ساتھ ساتھ عرب تاجروں کی بادبانی کشتیاں ساحلِ یلبار پر پہنچتی تھیں اور دسمبر یا جنوری میں یہاں کے گرم مسالے جوہرات اور موتی لے کر یہ بحری تاجر واپس چلے جاتے تھے۔ سواحلِ عرب سے یہ مال اونٹوں پر لے کر مصر و شام کی منڈیوں میں پہنچ جاتا تھا، ساحلِ یلبار پر کزنگ پور (یا "مزیریس") اور بنگارے نامی بندرگاہیں اس بحری تجارت کا بڑا مرکز تھیں چنانچہ رومی قیصروں کی بہت سی پرانی اشرفیاں یہاں سے دستیاب

ہوی ہیں ء کوروسٹڈل کی جانب گور کی اور پوتارہ دو قدیم بندرگاہوں کا ذکر آتا ہے جہاں سے ہندوستان کا مال مصر و اطالیہ کے شہروں تک پہنچتا تھا ء چونکہ ادھر سمندر اپنی جگہ سے کسی قدر ہٹ گیا اس لئے وہ قدیم بندرگاہیں خشکی میں رہ گئیں اور جب بحری تجارت نہ رہی تو اُن کی وہ رونق اور آبادی بھی نہ رہی اور وہ رفتہ رفتہ ویران ہو گئیں۔

ان تمام تعلقات اور اثرات کے باوجود، یاد رکھنا چاہئے کہ یہ (کشان) بادشاہ نسلًا ترکستانی اور مذہب کے اعتبار سے وسیع مشرب بت پرست تھے جنھیں ایرانی اور یونانی اصنام کے روبرو سجدہ کرنے میں باک تھا نہ ہندوستانی دیوتاؤں کے پوجنے میں۔ اُن کے بادے اور پاؤں میں نرم چمڑے کے موزے دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ بیرونی ہند سے وہ لباس کی طرز اپنے ساتھ لائے تھے کیونکہ قدیم ہندوستان میں چساور یا دھوتی کے سوا کسی لباس کے پہننے کا عام رواج نہ تھا ء

باب ہشتم

پہلی فصل - سلطنت گدھ کا دوسرا دورِ فروغ

قدیم تاریخ ہند کی یہ ”صلائے بازگشت“ بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ سلطنت گدھ کو پہلی مرتبہ بھی اس وقت عروج ہوا جب اجاستر نے لچھوی قوم کی کسی امیرزادی سے شادی کی۔ اور دوسری مرتبہ بھی اس ریاست نے فروغ پایا تو اس کا پہلا واقعہ بلکہ شاید قوی سبب یہی تھا کہ گدھ کے گمنام سے راجہ چندرگپت کا اسی لچھوی قوم کے خاندان شاہی میں پیوند ہوا، یہ غیر ہندی قوم جس کے ساتھ راجگان ہند کا سبجوگ ایسا مبارک ثابت ہوا، دوسری صدی عیسوی کے شروع میں ملک نیپال پر قابض ہو گئی تھی۔ مگر اس ایک واقعے کے سوا، پانچویں صدی ق م سے چوتھی صدی عیسوی تک اس کا کہیں نام سننے میں نہیں آتا۔ ممکن ہے کہ سنگ خاندان کے زوال کے وقت ان کا دستِ تصرف خاص پائے تخت پانلی پتر تک دراز ہو گیا ہو اور گدھ کی سلطنت کے خاتمے میں ان کا بھی کچھ حصہ ہو۔ لیکن یہ سب بے بنیاد قیاسات ہیں البتہ اس میں

گپت خاندان کا
آغاز

کوئی شک نہیں کہ انہی کے ہاں رشتہ ہو جانے سے چندرگپت کو یہ حوصلہ ہوا تھا کہ اس نے ادھی راج یا "وشہنشاہ" ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس کے سکوں پر اپنے نام کے ساتھ اس لچھوی بیوی کمار دیوی کا نام بھی کندہ ہے اور کتبات میں اس کا نامور جانشین کمار دیوی کا بیٹا ہونے پر فخر کرتا ہے۔ اور یہ دونوں باتیں مذکورہ بالا قول کی تائید میں پیش کی جا سکتی ہیں۔

اس خاندان کا نام چندرگپت سے بھی پہلے کا ہے لیکن اس کا (گپت نامی) دادا چھوٹی سی ریاست کا معمولی رئیس تھا اور سلطنت کی شان چندرگپت (اول) ہی کے زمانے میں پیدا ہوئی۔ اسی نے گنگا جنا کے سنگم تک اپنا علاقہ بڑھایا اور اپنے نام کا ستم الگ جاری کیا جس کا کئی صدی تک ہندوستان میں رواج تھا۔ اس کا آغاز فروری ۳۲۰ء سے ہوتا ہے۔ اور اسی کو چندرگپت اول کی باضابطہ تخت نشینی کی تاریخ سمجھنا چاہئے اگرچہ کمار دیوی سے اس کی شادی ۳۱۹ء میں ہوئی تھی، غرض جس طرح ۳۲۰ء ق م میں چندرگپت موریا کی تخت نشینی نے مگدھ کی پہلی سلطنت کا آغاز کیا تھا اسی طرح اس کے ہمنام چندرگپتا کی بادشاہی ۳۲۰ء سے مگدھ کے دوسرے دورِ فروغ کا افتتاح کرتی ہے۔

طور پر علم نہیں اور نہ یہ معلوم ہے کہ اس نے کب وفات پائی۔ قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی وفات کا اور اس کے بیٹے سمدر گپت کی جانشینی کا سال ۳۳۲ء ہے اور گپت خاندان کا یہی وہ اقبال مند بادشاہ ہے جس نے گدھ کو دوبارہ ہند کی سب سے بڑی سلطنت بنا دیا۔ دربار کے شاعر ہریشن نے اس کے جنگی کارناموں کے بیان میں جو قصیدہ مدنیہ لکھا تھا وہ اشوک کی ایک لاکھ پر کندہ کیا ہوا ملامت ہے۔ اور یہ انسانی مذاق اور خیالات کے تنوع کا عجیب نمونہ ہے کہ لاکھ کے ایک پہلو پر تو درویش مزاج اشوک "نفس کشی" کو انسان کی سب سے بڑی فتح بتاتا ہے اور دوسری طرف دیکھئے تو سمدر گپت کو جنگ جوئی اور جدال و قتال پر اس قدر ناز ہے کہ وہ بادشاہ کا فرض ہی "ملک گیری" کو قرار دیتا ہے۔ بہر حال، اگر ہریشن کے قصیدے میں کچھ بھی قصداً ہے تو اس بات کو ماننا پڑے گا کہ غالباً سمدر گپت تاریخ ہند کا سب سے بڑا فاتح گزرا ہے جس نے دکن پر گیارہ حملے کئے اور شمال میں نو بڑی بڑی لڑائیاں لڑا۔ بدوی قبائل کے سرداروں یا سرحد پر ہمایہ بادشاہوں سے جو مقابلے ہوتے رہے وہ ان کے علاوہ ہیں، واضح رہے کہ ہریشن کا قصیدہ کوئی باقاعدہ تاریخی تحویر نہیں ہے اور عہد سمدر گپت کے واقعات و سنین بھی بہت کچھ تاریک و مشکوک ہیں۔ مگر ہم یہاں اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ونڈٹ اسمتھ کی تحقیقات کا خلاصہ

پیش کر دیں۔ کیونکہ یہی وہ مصنف ہے جس نے کئی سال کی محنت و عرق ریزی کے بعد سمر گپت کے حالات دریافت کئے اور اسے دنیائے تاریخ میں روشناس کیا ورنہ پہلے لوگ اس کا نام تک نہ جانتے تھے؛

فتوحات اور
دستِ سلطنت

سن ۳۷۵ء میں لکھتا ہے کہ قدیم ہندوستان کے اس ورنپولین، یا "بلک کافور" نے اول شمالی علاقوں کو فتح کیا ہوگا جس کے بغیر جنوب کے دور دست ممالک میں پیش قدمی کرنا دشوار تھا؛ ٹھیک سن کا پتہ نہیں چلتا لیکن غالباً جنوب پر اس نے ۳۷۵ء کے قریب زمانے میں فوج کشی کی اور پہلے وادی مہاندی کے راجہ مہندر کو زیر کیا۔ پھر وسط ہند کی غیر آباد اور نیم متہذبن ریاستوں کو پامال کرتا ہوا وہ ملک کلنگ میں در آیا اور وہاں کے بعض مشہور قلعے اور پائے تخت پشت پور کو اس نے مستحکم کیا۔ یہ شہر دریائے گوداوری کے دہانے سے پچیس تیس میل شمال میں واقع اور پتھاپورم کے نام سے مشہور ہے؛ پھر اس نے گوداوری اتر کے ونگی کے راجہ کو شکست دی اور کانچی (یا کنچی ورم) تک بڑھ آیا جہاں ان دنوں پلو (Pallava) قوم کا کوئی راجہ حکومت کرتا تھا؛ اسی شہر کو جو پیلا رندی پر موجودہ مدراس کے جنوب مشرق میں واقع ہے، اولوالعزم حملہ آور کی پیش قدمی کی جنوبی حد سمجھنا چاہئے، غالباً یہیں پہنچ کر اس نے اپنے فتح مند رفقا کو واپسی کا حکم دیا اور موجودہ

ہمارا شہر اور خانہ دہلی کے راجاؤں کو مغلوب کرتا ہوا، منظر و منصور اپنے وطن میں داخل ہوا (قیاناً ۱۲۵۶ء) بے شبہ ان جنوبی فتوحات میں بہت کچھ لوٹ کا مال حملہ آوروں کے ہاتھ آیا ہوگا لیکن یہ علاقے مستقل طور پر سلطنت گدھ میں شامل نہیں ہوئے اور سمرگپت محض اطاعت کا عارضی اقرار لے کر واپس چلا گیا، اس کی سرحدی لڑائیاں جن کا ہریشن بہت بڑھا چڑھا کے ذکر کرتا ہے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں البتہ ان سے سمرگپت کی حدود سلطنت قرار دینے میں مدد ملتی ہے اور ہم خاصی طرح یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہنگلی سے جتنا اور ہمالیہ سے زبردتا تک کشور ہند کا بہترین حصہ سمرگپت کے زیر نگیں تھا اور ان کے آگے بھی مشرق و جنوب کی سرحدی ریاستیں اس کی اطاعت کا دم بھرتی تھیں؛

ایسے طاقتور ہمسائے سے کابل و بخارا کے شاہان گشان کو دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کا خیال آیا تو یہ قدرتی بات تھی۔ لیکن دربار لنکا سے رسل و رسائل کا سبب دوسرا پیدا ہو گیا۔ وہ یہ کہ وہاں کے ہمعصر بادشاہ سری میگھون نے بودھ گیا کی زیارت کے لئے دو بھکشو بھیجے اور ان غریب الوطن راہبوں کی ہندی باشندوں نے کچھ آؤ بھگت نہ کی۔ شاید اس بے مروتی کا سبب یہ ہو کہ لنکا والے بودھ مت کے جس فرقے میں داخل تھے، یہاں اسے اچھا نہ سمجھا جاتا تھا؛

بہر حال، یہ شکایت لنکا میں پہنچی تو سری میگھ ون نے سمرگپت کے پاس بہت کچھ تحفے تحائف اور سفیر بھیجے اور درخواست کی کہ دربار لنکا کو اس متبرک درخت کے قریب (جہاں گوتم بڑھ کو عرفان حاصل ہوا تھا) خانقاہ بنانے کی اجازت دے دی جائے۔ سمرگپت نے خوشی سے قبول کیا اور شاہ لنکا نے جو عظیم الشان خانقاہ تعمیر کرائی وہ ہوئین چونگ چینی کی سیاحت کے زمانے تک سلامت اور آباد تھی۔

وفات اور
ذاتی اوصاف

غالباً دکن کی مہم سے مراجعت کے بعد ہی اس اقبال مند راجہ نے ”اشوہرہ“ یعنی اسپ قریان کا جشن منقہ کیا تھا۔ مگر اس کے بعد وہ عرصہ دراز تک فرماں روائی کرتا رہا اور قرآن سے پایا جاتا ہے کہ اُس نے ۳۵۰ء میں وفات پائی، ہریشن اپنے ممدوح کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتا ہے اور لکھتا ہے کہ وہ فن شعر و موسیقی میں یگانہ روزگار تھا، اس قول کی قطعی تردید یا تصدیق کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ لیکن اس میں تو کوئی شک نہیں کہ سمرگپت میں سپہ سالاری اور حکمرانی کی قابلیت بدرجہ اعلیٰ موجود تھی اور موسیقی سے اس کے شوق کا ثبوت وہ سکتے ہیں جس میں وہ تخت پر ایک پاؤں لٹکائے ستار لئے نظر آتا ہے، شاعر کا یہ بیان تسلیم نہ کرنے کی بھی کوئی وجہ نہیں کہ سمرگپت علم و فضل کا قدردان مزیلی اور مذہبی مسائل کے مطالعے اور مباحثے کا بہت شایق تھا، اور ہر قسم کے اہل کمال اس کے

دربار کی زینت بڑھاتے تھے تو
 سمرگپت نے آئندہ بادشاہی کے لئے اپنے کئی
 بیٹوں میں سے چندرگپت کو منتخب کر لیا تھا جس نے تخت
 پر بیٹھکر ”بکراجیت“ (Vikramaditya) یعنی
 شمس الدولہ کا لقب اختیار کیا۔ ہندوستان میں ایک قدیم راجہ
 ”بیر بکراجیت“ کی خست و کامرانی اور عدل و انصاف کے
 بہت سے قصے مشہور ہیں، عجب نہیں کہ وہ یہی چندرگپت
 ثانی ہو۔ اس قیاس کے خلاف سب سے بڑا دھوکا ”بکرمیت“
 سے ہوتا ہے جس کا آغاز شش م سے ہوا۔ لیکن
 چندرگپت ثانی کہانیوں کا بیر بکراجیت ہو یا نہ ہو اس میں
 شبہ کی مطلق گنجائش نہیں کہ اول اول یہ سمت ”بکراجیت“
 کے نام سے منسوب نہ تھا تو

بہر حال، گپت خاندان کا یہ فرماں روا بھی اپنے وقت
 کا بڑا اقبال مند اور بہادر بادشاہ گزرا ہے اور مالوسے پر کئی
 بار حملے کر کے مغربی ست راجوں کی حکومت کا اسی نے خاتمہ
 کیا۔ اس طرح، گدہ کی سلطنت ایک مرتبہ پھر قریب قریب
 اسی قدر وسیع اور طاقتور ہو گئی جس قدر کہ شاہانِ موریہ کے
 زمانے میں تھی، ان ست راجوں کے آخری حکمران کی پائلی پترا
 میں موت کا قصہ پہلے ہماری نظر سے گزر چکا ہے۔ مگر

اس سے ہم زیادہ سے زیادہ یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ کبراجیت کی وہ فتح گجرات و مالوہ میں زور و قوت کے علاوہ بعض اتفاقی حادثات یا کسی مکر و فریب کا بھی دخل تھا۔

اس نامور بادشاہ کی بھی کوئی تاریخ موجود نہیں لیکن فاطمیان کی خوش قسمتی سے فاطمیان چینی اس کے آخری عہد حکومت میں

اس چینی سیاح کے متعلق انہی کلو پیڈیا میں جو نوٹ لکھا ہے اس کا یہاں ترجمہ کر دینا فائدے اور دلچسپی سے خالی نہ ہوگا :-

”بودھ مت کے اس چینی دویش نے کہ زائر سیاح اور انشا پر داز بھی ہے ہندوستان کے متعلق چینی زبان میں سب سے پہلی اور قابل قدر کتاب لکھی تھی۔ ان دنوں سلطنت ”تسین“ (یعنی چین) کا پائے تخت چنگن یا سی گان فو میں تھا، یہیں سے فاطمیان روانہ ہوا۔ اور چین کی بڑی دیوار سے گزر کے اس نے ”ریت کا دریا“ یعنی رشت گوئی طے کیا۔ یہ صحرا ”شیالین اور ہوائے گرم“ کا گھر سمجھا جاتا تھا زمین پر کوئی جانور یا ہوا میں کوئی پرندہ وہاں نظر نہ آتا تھا اور صرف مردوں کی ہڈیاں راستے کا نشان دیتی تھیں، مہنت پہنچ کر ہمارے سیاح نے بودھ مت کے ایک میلے کی سیر دیکھی جو اُن دنوں وہاں ہو رہا تھا، اُس کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسی علاقے میں نیز یار قند و افغانستان میں جو ”قرون وسطیٰ“ کے ختم ہونے سے پہلے پوری طرح اسلامی رنگ میں رنگ گئے تھے، اُس وقت بودھ مت کا دور دورہ تھا، پھر ہندو کش کی ”دیوار جیسی پہاڑیوں“ سے اتر کر جن کی خطرناک بلندی دس ہزار فٹ تھی، فاطمیان (مسلمانوں کے قریب) واڈی سدھ کے راستے ہندوستان پہنچ گیا اور آئندہ دس برس اس نے ”بودھ مت کی اسی مرکزی اقلیم“ میں گھومنے اور

ہندوستان آیا اور اپنا سفر نامہ ہمارے لئے یادگار چھوڑ گیا ہے۔ بودھ مت کے مقدس مقامات کی زیارت اور کتب و روایات کی تلاش اس کے سفر کی اصلی غرض تھی اور اس لئے وہ کسی دوسری طرف بہت کم توجہ کرتا ہے حتیٰ کہ اپنے زمانے کے ہندی فرماں روا کا بھی کوئی ذکر نہیں کرتا۔ بایں ہمہ اس کی تحریر سے بعض کام کی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں اور بکرامجیت کے نظم و نسق کا دھندلا سا خاکہ نظر میں پھر نے

(بقیہ حاشیہ) پشاور سے افغانستان (خاص کر کابل کے علاقے) تک اور دوسری طرف وادی گنگا تک کئی سفر کئے اس کی خاص غرض یہ تھی کہ ان مقامات کی زیارت کرے جن میں گوتم بودھ نے اپنی زندگی بسر کی، مذہبی کتابوں کی نقل حاصل کرے اور اس مذہب کے اُن فقرا اور حکماء کی صحبت سے مستفید ہو جنہیں برہن (دوبارہ زور پکڑ جانے کے باوجود) ابھی تک ملک سے دفع نہ کر سکے تھے

x x x x x

لیکن مختلف مقامات کی سیر کے بعد اس کے سفر نامے میں مذہبی اور باطنی مسائل کی طویل بحث آجاتی ہے یعنی کبھی کرات اور خلاق کے قصے اور کبھی اخلاق کے مباحث، دنیاوی مشاہدات کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑتے۔ حتیٰ کہ فابیان گنگا کے دہانے سے تجارتی جہاز میں روانہ ہو جانا ہے اور جودہ دن میں لٹکا پہنچ کر دم لیتا ہے۔ یہیں اس نے اُن مذہبی کتابوں کی نقلیں لیں جن کا چین میں کوئی نام تک نہ جانتا تھا۔ وہ تہوار بھی اس نے یہاں دیکھا جس میں ہر سال گوتم بودھ کے دانت کی لوگ زیارت کرتے تھے۔

دین اسلام کے آغاز سے دو صدی پہلے اس جزیرے میں عربوں کی بحری تجارت کا

لگتا ہے:- ہندوستان کے اکثر صوبوں میں فراغت و آسودگی نظر آتی ہے۔ ایسے قوانین بہت کم ہیں جو عمال کو رعایا کے پریشان کرنے کا موقع دیں۔ جرائم کی سزائیں بھی نسبتاً ہلکی ہیں اور اکثر جرموں پر اکتفا کی جاتی ہے۔ رہنری اور بغاوت کی سزاؤں میں عدالت مجرم کا دست راست کاٹ دینے کا حکم دے سکتی ہے لیکن اس انتہائی سختی کی زیادہ نوبت نہیں آتی اور مجرموں کو اذیت دینے کا بھی رواج نہیں، ملک میں جرائم کی کمی ہے اور راستے خاصی طرح محفوظ ہیں چنانچہ رستے میں لٹ جانے کی مصیبت سے جو ساتویں صدی میں

(بقیہ حاشیہ) بھی فابیان نے ذکر کیا ہے، یہاں سے وہ سمندر کے راستے دریائے بنگ سی کیانگ کے مہانے تک پہنچ گیا۔ راستے میں جاوا پر جہاز بدلنے کی ضرورت پڑی اور ایک جگہ طوفان میں اس کا جہاز ڈوبتے ڈوبتے بچاؤ

چوتھی صدی عیسوی کے اواخر میں ہند اور وسط ایشیا میں جو قوت اور اکثر مقامات پر جو غلبہ بودھ مت کو حاصل تھا، فابیان کا سفر نامہ اس کی نہایت عمدہ شہادت ہے۔ کتاب کے سیاق سے ہر جگہ اس کے مذہبی شغف اور علیت و فرست کا پتہ چلتا ہے۔ گو کہیں کہیں شوق زیارت نے اسے حد اعتدال سے گزار دیا ہے، لیکن جو کچھ اس نے لکھا وہ نہایت احتیاط و صحت کے ساتھ لکھا اور اس کے اکثر مقامات سیاحت کا اس زمانے میں بہ آسانی پتہ چل جاتا ہے۔ باقی اس کے مذہبی جذبے کا اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اپنے وطن چین کو وہ محض

”سرحدی سرزمین“ بتاتا ہے اور بودھ مت کا ”صدع“ ہندوستان کو قرار دیتا ہے، ”جلد دہم

ہوئیں چونگ یا ہوئیں تسانگ پر کئی مرتبہ پڑی، فاپہسان
ایک دفعہ بھی دو چار نہیں ہوا۔

اس درویش ستیاج نے بودھ مت کے متعلق جو کچھ
لکھا ہے اس سے ہم اگلی فصل میں کام لیں گے یہاں
سلسلہ واقعات درست رکھنے کے لئے کمار گپت کا ذکر کر
دینا چاہئے جس کے زمانے سے گپت خاندان کی حکومت میں
زوال آنے لگا۔ وہ اپنے باپ کے بعد ۳۱۳ء میں تخت
نشین ہوا اور عرصہ دراز تک اقبال و کامرانی کے ساتھ حکومت
کرتا رہا بلکہ جشن ”اشوہہ“ کے بپا کرنے سے ظاہر ہوتا ہے
کہ شاید اُس نے کچھ اور علاقہ بھی فتح کیا تھا، لیکن آخری
ایام حکومت میں اُسے کسی ہمسایہ قوم سے سخت زکیں پہنچیں
اور ان لڑائیوں نے سلطنت کو ایسا صدمہ پہنچایا کہ وہ کمار گپت
کی زندگی میں پوری طرح نہ پنپ سکی۔ اور ادھر اس کے مرتے
ہی (۳۵۵ء) ان تماناریوں کے خوفناک حملے شروع ہو گئے
جنہیں عام طور پر ”گورے ہون“ کے نام سے موسوم کرتے
ہیں۔

دوسری فصل۔ مذہب اور علوم و فنون

تماناریوں کی یورش اور گپت خاندان کے زوال و خاتمے کا
ذکر اگلی فصل میں آئے گا۔ مگر ان بادشاہوں کے عہد عروج سے

گزرتے وقت مناسب ہے کہ ہم ایک نظر اس زمانے کے اندرونی حالات پر ڈال جائیں، یعنی ۱۳۳۰ء سے ۱۳۵۵ء تک اہل ہند کے مذہبی خیالات اور علوم و فنون کے متعلق جبکہ معلومات حاصل ہو سکی ہے اس کا ضروری خلاصہ پیش کر دیں تاکہ ناظرین کو ایک حد تک اس عہد کی اصلی تہذیب کے سمجھنے کا موقع مل جائے۔

مذہب کے متعلق ہمارا سب سے اچھا ماخذ فاپیان چینی کا سفرنامہ ہے جس نے پانچویں صدی کے آغاز میں شمالی ہندوستان کے بہت سے مقامات کی سیاحت کی اور لوگوں کے مذہب خاص کر بودھ مت کے حالات تفصیل سے قلم بند کئے، اس نے اپنے پہلے ہی سفر میں دریائے سندھ سے جتنا تک بودھ مت والوں کی بہت سی خانقاہیں دیکھیں جن میں ہزاروں بھشکو اس مذہب کی تسلیم و تربیت حاصل کرتے تھے۔ بودھ کے قوانین کی ہر جگہ پابندی کی جاتی تھی۔ جانداروں کو مارنا، مویشی کی خرید فروخت حتیٰ کہ مرغ پالنا بھی نہایت مذموم سمجھا جاتا تھا۔ اور اس قانون کے دائرے سے اگر کوئی باہر تھا تو وہ چندال قوم کے لوگ تھے جنہیں اُن کے دوسرے بنی نوع اس قدر نجس جانتے تھے کہ نذا چھو جانا اُن کے تمام جسم کو ناپاک کر دیتا تھا، بودھ مت کے بھکشوؤں کی بڑی عزت کی جاتی تھی۔ ہر صاحب استطاعت انہیں خیرات دینا موجب ثواب جانتا تھا اور

بودھ مت کا
ظاہری حال
دیکھو

سرکاری طور پر اُن کی خانقاہوں کے نام جو رقوم یا جاگیریں ملتی تھیں وہ اس کے علاوہ ہیں؛

لیکن یہ بودھ مت کے ایک پر جوش زائر کے خیالات ہیں جسے اپنے مقدس مقامات کے دیکھنے کا شوق صدمہ میل سے ہندوستان کھینچ لایا تھا۔ یہی سبب ہے کہ وہ اپنے مذہب کی ہر شے کو عقیدت مندانہ دیکھتا ہے اور اس کی کمزوری یا خامی پر گہری نظر نہیں ڈالتا؛ اپنے مشاہدات بیان کرنے میں اس نے صداقت سے تجاوز نہیں کیا باں ہمہ بودھ مت کے غلبے کی جو تصویر کھینچی وہ اس کی سادگی اور ظاہر بینی کی غماز ہے۔ جدید اہل تحقیق نے اس بات کے ثبوت فراہم کر لئے ہیں کہ جب فاہیان ہندوستان آیا تو اس وقت بودھ مت میں زوال شروع ہو گیا تھا؛ خانقاہوں کی دولت مندی یا رونق محض فائشی چیز تھی ورنہ اس کی اصلی قوت تیسری صدی سے گھٹنے لگی تھی اور حریفِ قدیم (یعنی برہمنی مت) کا زور بڑھ رہا تھا؛

برہمنوں کے اس طبع دوبارہ فروغ پانے کے اندرونی اسباب خواہ کچھ ہی ہوں یہ امر واقعہ ہے کہ مالوکے کے ست راپ اور گپت خاندان کے فرماں روا اُن کے پر جوش حامی تھے۔ اس بات کی شہادتیں موجود ہیں کہ بودھ مت کے عین عروج کے زمانے میں بھی، ہندوستان کا قدیم مذہب فنا نہیں ہوا تھا بلکہ پہلی صدی عیسوی ہی میں بعض گشتان

برہمنی مت کا
اجیاء

بادشاہ شہوجی کے پرستار یعنی برہمنوں کے معتقد تھے۔ خود
 مہاراجہ کنشک کے عہد میں بودھ مت کے جس فرقے (یعنی
 ”مہایانی“) نے فروغ پایا اس کے بعض عقائد میں برہمنوں
 سے اتفاق کر لیا گیا تھا اور بُت پرستی غالباً اس سے بھی
 پہلے ان کے ہاں جائز و رائج ہو گئی تھی۔ پس یہی دو باتیں
 اس بات کا کافی ثبوت ہو سکتی ہیں کہ بودھ مت اپنی جگہ پر
 قائم نہ رہ سکا اور اس کے علما کو برہمنوں کے مقبول عام
 عقائد اختیار کرتے ہی بنی۔ ظاہر میں تو یہ اُس کی قبولیت
 کو بحال رکھنے کی بہت کارگر تدبیر تھی مگر درحقیقت اپنے
 ماہر الامتیاز اصول کو بدلنا، گویا بودھ مذہب کی جڈاگانہ ہستی
 کو میٹا دینا تھا۔

سنسکرت کا
 احیاء

بودھ مت کے اس زوال کا برہمن اگر سبب نہ تھے
 تو سب سے زیادہ فائدہ اٹھانے والے ضرور تھے۔ اور
 ان کو بڑی تقویت اپنی قدیم زبان کی بدولت پہنچی جس نے
 اسی زمانے میں دوبارہ سر اُبھارا اور شاہانِ گپت کی قدردانی
 سے بہت جلد ہندوستان کی مروجہ پراکرتوں پر غالب آگئی۔
 منو کا دھرم شاستر، کالیداس کی شاعری، آریابھٹ کی ہیئت
 و ہندسہ کی تصانیف، اسی زمانے کی شہرہ آفاق یادگار ہیں
 ہیں جنہوں نے سنسکرت کو ہند کی سب سے مستند علمی زبان
 بنا دیا۔ پرانوں کے پہلے مجموعے (وایوپران) کو بھی اسی زمانے
 سے منسوب کرتے ہیں اور ونشٹ اسمتھ کے نزدیک وہ

چوتھی صدی کے نصف اول میں مرتب ہوا اسی موقع کی
 رائے ہے کہ خاندانِ گپت کے زمانے میں اس علمی تحریک
 کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ انہی ایام میں اہل ہند
 کو چین و رومۃ الکبریٰ کے تمدن سے روشناس ہونے کا
 موقع ملا۔ مالک غیر سے میل جول ہمیشہ قوموں کی علمی
 اور دماغی ترقی کا محرک ہوتا ہے اور گو ظاہری ثبوت یہ
 نہ آئیں، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اُن دنوں رومی
 مقبوضات سے ہندوستان کے تجارتی تعلقات اور آمدرفت
 کا سلسلہ جاری تھا۔ اور چین سے دینی اور دنیاوی
 تعلقات ہونے کی تو بہت سی شہادتیں موجود ہیں۔
 مگر اس عہد میں غالباً سب سے نمایاں ترقی عمارت
 و نقاشی کے فن میں ہوئی اور قدیم ایرانیوں کی تقلید سے
 ہندوستان کے معمار اسی زمانے میں آزاد ہوئے۔ کیونکہ تاریخ
 کی جہاں تک دسترس ہے، قدیم سے یہاں کی بڑی عمارت
 ایرانی محلات کے طرز پر بنائی جاتی تھیں۔ لیکن گپت خاندان
 کے ایام حکومت میں جہاں عمارتی نقش و نگار کے فن میں
 بڑی ترقی ہوئی وہاں خود عمارت کی بھی نئی نئی صورتیں نکالی

عمارت سنگراشی
 اور نقاشی

براسواصل ہند اور جزائر شرق الہند میں اُن دنوں خوب آمدرفت تھی اور بعض
 تحریروں میں رومی قیصروں کے ہاں ہندوستانی سفارتوں کے جانے کا بھی ذکر
 آیا ہے (اؤکس ہس۔ ۱۶۲)۔

جانے لگیں اور اسی زمانے کا خاص طرز عمارت مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے تک مقبول رہا۔ فن عمارت کے ساتھ قدرتی طور پر سنگ تراشی نے فروغ پایا اور اس فن کے بہترین ہندی نمونے اسی زمانے سے منسوب کئے جاتے ہیں، اسی ضمن میں ونسٹ اسمتھ نے نقاشی کی ترقی کو بھی اس عہد سے منسوب کیا ہے اور نظیر میں غار ہائے اجنتہ کی لاجواب تصویریں پیش کی ہیں (ارتھی ہسٹری صفحہ ۳۰۶) ان میں سے بعض تصویریں زیادہ قدیم ہیں اور بعض چھٹی ساتویں صدی عیسوی، یعنی اُس

۱۔ انسانی کلو بیڈیا۔ جلد چہارم صفحہ ۱۲۹ -

ونسٹ اسمتھ اپنی تازہ ترین کتاب میں لکھتا ہے کہ ”عہد گیت کا سب سے مشہور اور قابل دیدہ سنگی مندر دو گڑھ ضلع جھانسی میں سلامت رہ گیا ہے اس کی تعمیر پانچویں صدی یا چھٹی صدی کے نصف اول سے منسوب کر سکتے ہیں اور اس کی دیواروں پر ہندی سنگ تراشی کے بعض بہترین نمونے موجود ہیں۔ مگر یہ مندر زیادہ وسیع نہیں اور بھیدتر گاؤں ضلع کانپور کا خشتی مندر اس سے بڑا ہے جو غالباً چندر گپت ثانی کے عہد میں بنا تھا۔۔۔ اس عہد کے صنایع اور کاریگر دھاتوں کے کام میں بھی پوری مہارت رکھتے تھے۔ دلی میں جو لوہے کی لاٹھ ہے وہ سمدر گپت کے زمانے میں ڈھالی گئی اور صنعت قلبِ معاہدوں کا لاجواب نمونہ ہے، وسیع پیمانے پر تانبے کے بُست ڈھالنے کا عمل بھی ان دنوں کامیابی سے کیا جاتا تھا۔ چنانچہ کوتم بودہ کی ایک ڈھلی ہوئی سوز جو نالعدا (بہار) میں چھٹی صدی کے اواخر میں نصب کی گئی تھی، ۲۶ گز کے قریب اونچی تھی۔ اس کی ایک اور پانچ فٹ اونچی مورت جو سلطان گنج سے دستیاب ہوئی، برنگم (انگلستان) کے مجاہد خان میں موجود ہے، اور یہ چندر گپت ثانی کے عہد میں تیار کی گئی تھی۔“

(اوکس ہس - ۱۶۱)

زمانے کے بعد تیار ہوئیں جو ہمارے پیش نظر ہے۔ لیکن یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ اجنتہ کے دو غار اسی پانچویں صدی میں تراش کر آراستہ کئے گئے تھے پڑ

تیسری فصل۔ ہونوں کی یورش اور گپت خاندان کا خاتمہ

لیکن اب ہمیں پھر اپنے سلسلہ تاریخ کی طرف عود کرنا چاہئے کہ جب راجہ کمار گپت نے ۳۵۰ء میں وفات پائی اور اس کا بیٹا سکند گپت جانشین ہوا تو سلطنت مشکلات میں گھری ہوئی تھی۔ اس کا باپ اپنے آخری زمانہ میں جس قوم ("پٹی متر" نامی) سے مصروف جنگ رہا گو اس کے متعلق یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ وہ شمالی ہند کی تھی یا جنوب کی تاہم وہ اتنی قوی ضرور تھی کہ کمار گپت کی فوجوں پر غالب آئی اور اگر ولی عہد (یعنی سکند گپت) ہمت و جفاکشی سے کام نہ لے تو سلطنت کی خیر نظر نہ آتی تھی لیکن سکند گپت نے رات کو رات اور دن کو دن نہ سمجھا اور سخت کوشش کے بعد آخر کار غنیم پر فتح

سکند گپت

۱۔ انسانی کلوچھیا جلد اول صفحہ ۴۵۱

۲۔ اوکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۱۶۱ بحوالہ جرنل ایشیاٹک سوسائٹی؛

پائی، اس لڑائی سے نجات حاصل ہوئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ وسط ایشیا کے خان بدوشوں کا سیلاب ہند پر اُمنڈ پڑا۔ اور سکند گپت کو بادشاہ ہوئے غالباً تین سال بھی نہ ہوئے تھے کہ اُسے سلطنت کو وحشیوں کے اس ٹڈی دل سے بچانے کی فکر پڑ گئی۔ مگر پہلی مرتبہ اس نے فتح پائی (قیاساً ۳۵۰ء) اور چند سال کے لئے اس بلائے سخت کو طال دیا۔

”گورے ہوں“

یہ خوفناک حملہ آور نسلِ وسط ایشیا کی انہی اقوام سے تعلق رکھتے ہیں جن کی یورشیں بار بار یورپ و ایشیا کے امن میں خلل ڈال دیتی تھیں۔ مگر پانچویں چھٹی صدی عیسوی میں اُن کے جو گروہ اپنے غیر آباد علاقوں سے نکل کر ایران و ہندوستان پر حملہ آور ہوئے ان کے قومی نام میں اختلاف ہے۔ اسلامی مصنف انہیں ”ہیتان“ اور چینی ”ہیتھا“ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اصلی نام غالباً ”ہپ تال“ تھا اور مشرقی رومیوں نے اسی کو بدل کر ”اقالوی“ کر دیا جو تھوڑے سے تغیر کے ساتھ یورپ کی زبانوں میں رائج ہے۔ (انگریزی میں Ephaltite کہتے ہیں) لیکن ہندوستان میں ان کو ”ہون“ (ہونڑ یا ہونا) کہتے تھے۔ چونکہ یہ بہت عام نام ہے اس لئے رنگ کی مناسبت سے سفید یا گورے کی صفت بڑھا دی گئی کہ دوسرے ساماریوں میں اور ان پانچویں صدی کے حملہ آوروں میں

امتیاز کیا جا سکے ؟
 معلوم ہوتا ہے کہ ان وحشیوں نے پانچویں صدی کے
 آخر میں ماوراء النہر پر قبضہ پایا تھا اور وہاں سے ایران و
 ہندوستان کی جانب پاؤں پھیلا رہے تھے۔ ساسانی بادشاہوں
 سے ان کی (بہرام پنجم کے وقت سے خسرو نوشیروان کے
 کے زمانے تک) بار بار لڑائیاں ہوتی رہیں اور سلطنت
 ایران کو اس خطرے سے نجات اس وقت ملی جب کہ
 نوشیروان کے ترک حلیفوں نے ان کی حکومت کا تختہ الٹ
 دیا (۶۵۰ء) تاریخ میں ترکوں کا نام پہلی مرتبہ اسی ضمن میں
 آیا ہے ؟

لیکن ہونوں کا جو سیلاب ہندوستان کی طرف بڑھا
 تھا وہ یہاں کے بادشاہوں کے روکے نہ سکا۔ غالباً پہلی
 لڑائی جس میں سکند گپت نے فتح پائی اور بہت کچھ خوشیاں
 منائیں، ہونوں کے پورے لشکر کے ساتھ نہیں ہوئی تھی
 اور وہ ان دنوں ایران پر قبضہ کرنے کی دھن میں لگے
 ہوئے تھے ؟ چنانچہ جب ادھر سے کسی قدر فرصت ملی تو
 انہوں نے دوبارہ ہندوستان کا رخ کیا اور شمال مغربی

گپت خاندان
 کے آخری بادشاہ

مذہب کی یادگار میں سکند گپت نے ایک مینار پر وشنو دیوتا کا بت نصب
 کرایا تھا اس مورت کا پتہ نہیں لیکن وہ مینار ضلع غازی پور میں اب تک
 موجود ہے۔ اس پر جو کتبہ کندہ تھا وہ بھی اتفاق سے محفوظ رہ گیا ۱۲

پنجاب پر قابض ہو گئے۔ اب سلطنت گپت کا علاقہ قریب تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ چند ہی سال میں اپنے بچے پنجاب میں جانے کے بعد انہوں نے پھر سکند گپت پر پورش کی یہ باہمت راجہ اس مرتبہ ان خوفناک حملہ آوروں کے مقابلے کی تاب نہ لا سکا اور گدھ خاص کے سوا، تمام سلطنت پر ہونوں کا تسلط ہو گیا؛

ان واقعات کی تفصیل اور سین کا ٹھیک علم نہیں لیکن اتنا یقینی ہے کہ سکند گپت کے بعد (۳۶۷ء) اس خاندان کے راجہ فقط گدھ اور چند قریبی اضلاع کے حاکم رہ گئے تھے؛ ان میں پہلا شخص پور گپت ہے جس نے سکتے کی اصلاح کی یعنی سکند گپت کے وقت میں خزانہ خالی ہو جانے کی وجہ سے جو کم عیار اشرفی رائج کرنی پڑی تھی اس کی بجائے طلائے خالص کی اتنی بڑی اشرفی ضرب کرائی کہ پہلے ہندوستان میں کبھی رائج نہ ہوئی تھی؛

۳۸۵ء میں پور گپت کا بیٹا نرسم گپت بالادت راجہ ہوا اور اس نے عرصہ دراز تک حکومت کی جو ایشیائی ممالک میں اقبال مندی کی پہلی دلیل ہے؛ نرسم گپت کی دولت و شہرت کا دوسرا ثبوت وہ رفیع اشان مندر تھا جس کا ہوئین چونگ نے اپنے سفر نامے میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ یہ خشتی عمارت سو گز بلند تھی اور اس کی آراستگی میں بے شمار زر و جواہر صرف کیا گیا تھا۔ نرسم گپت نے یہ مندر بودھ مت والوں کے لئے

ان کے سب سے بڑے علمی مرکز نالندہ میں بنایا اور اسی سے ظاہر ہے کہ وہ بودھ مت کا پیرو یا کم سے کم معتقد ضرور تھا؛ لیکن نرسم گپت کی سب سے بڑی وجہ نام آوری یہ ہے کہ (ہوئین چوئنگ کے بقول) اسی نے وسط ہند کے راجہ جس دھرم (یشو دھرم Yasodharman) اور دوسرے رُسا کے ساتھ مل کر ہونوں کو شکست دی اور ان کے بادشاہ مہرگل (Mihiragula) کو مالوے سے مار کر نکال دیا؛ ہونوں کے پہلے سردار کا نام ترامن یا ترمان (Toramana) تھا اور اسی کی سپہ سالاری میں ان وحشیوں نے پنجاب، دوآب اور وسط ہند کے ملک فتح کئے چنانچہ پانچویں صدی کے خاتمے کے قریب ہم اسے مالوے میں حکمراں پاتے ہیں۔ والبعھی کے

ہونوں کی
”دوسری شکست“

ط اس مقام پر جو گاؤں کلکتے کے چندیل شمال میں اب آباد ہے اُسے ”بڑگاؤں“ کہتے

ہیں۔ ۱۲۔

۱۷۔ رسالہ ”ہندوستان ریویو“ (ماہ جنوری ۱۹۱۵ء) میں مسٹر پنالال نے بہ دلائل ثابت کیا ہے کہ نرسم گپت کا اس فتح میں کوئی خاص حصہ نہ تھا بلکہ وہ زیادہ تر جس دھرم ہی کی سعی سے حاصل ہوئی تھی؛ اس راسے کو وینٹ اسمتھ نے بھی تسلیم کر لیا ہے (اؤکس ہس۔ ”اڈیشنز اینڈ کرکشنز“)

۱۸۔ یہ شہر مشرقی گجرات میں اس جگہ واقع تھا جہاں اب (بھاؤنگر سے چند میل شمال مغرب میں) قصبہ و لا آباد ہے جیٹھی اور ساتویں صدی عیسوی میں یہاں بودھ مت والوں کی بہت مشہور درس گاہ تھی اور آٹھویں صدی تک یہاں کے راجہ خود مختار بادشاہت حکومت کرتے رہے حتیٰ کہ عرب فاتحان سندھ نے ان کی بادشاہی کا مہلخہ گل کر دیا؛

راجہ جنھوں نے مشرقی گجرات میں انہی دنوں اپنی علیحدہ سلطنت بنالی تھی، تران کے خراج گزار تھے اور اس ہون سردار نے ہندوستان کی چند ہی روز ہوا کھا کر وہ ہماراجہ، کا لقب اختیار کر لیا تھا، پھر جب وہ مرا (غالباً ۱۲۵۷ء میں) تو اس کے بیٹے مہرگل (Mihiragula) نے یہی لقب اور شیو پرستوں کا ہندی مذہب اختیار کیا۔ وہ نہایت سفاک اور جابر فرماں روا تھا اور بودھ مت کی کتابوں میں اس کے وحشیانہ مظالم کے بہت سے قصے محفوظ ہیں؛ مگر یاد رکھنا چاہئے کہ ابھی تک ہونوں کی مرکزی قوت میں زوال نہیں آیا تھا اور اس لئے تران و مہرگل غالباً اپنی اسی صدر حکومت کے ماتحت تھے جس کا پائے تخت ہرات کے قریب بامیان میں واقع تھا؛

بہر حال، اسی مہرگل کے ظلم و جور سے تنگ آ کر ہندوستان کے بہت سے رئیسوں نے ایک کیا اور غالباً جس دھرم کی سپہ سالاری میں ہونوں کو شکست دی (قیاساً ۱۲۸۰ء) ادھر مہرگل کے چھوٹے بھائی نے بغاوت کی اور پائے تخت ساکل (Sakala) یعنی موجودہ سیالکوٹ) پر قبضہ کر لیا؛ ان وجہ سے ہونوں کو مآوہ چھوڑنا پڑا اور خود شکست خوردہ مہرگل نے بھاگ کر کشمیر میں پناہ لی۔ کشمیر کے فرماں روا نے (جو غالباً اس کا ہم قوم تھا) مہربانی سے ایک جاگیر یا علاقہ عنایت کر دیا تھا مگر دو سال بعد مہرگل نے اپنے مرنے سے بغاوت کی اور اسے دھوکے سے قتل کرا کے خود بادشاہ کشمیر بن بیٹھا۔

پھر اُس نے ہزار ہا آدمیوں کو دریائے سندھ کے کنارے نہج
کرا دیا اور پہلے فرماں روا کے خاندان میں کسی فرد کو زندہ نہ
چھوڑا۔ وہ شو دیوتا کا پرستار تھا اور اس لئے بودھ مت
والوں سے اس کو شدید نفرت تھی۔ چنانچہ اس مذہب کے
درویشوں پر اس نے بڑے بڑے ظلم کئے اور ان کی بہت سی
خانقاہیں تڑوا کر جو کچھ ہاتھ آیا لوٹ لیا؛

یہ خلاصہ ہے اُن روایات کا جو ہوئین چوئنگ نے
اپنے ہندی ہم مذہبوں سے سن کر تحریر کی ہیں۔ مہرگل
کی موت کے متعلق اس چینی ستیاح نے یہ روایت نقل
کی ہے کہ ”جب وہ مرا تو اولے اور بجلی کے طوفان آئے،
آسمان تیرہ دتار ہو گیا، زمین ہل گئی اور مقدس ولیوں نے
فرمایا کہ دیکھو ہزاروں بے گناہوں کو مارنے اور بودھ کا
قانون توڑنے کی یہ سزا ہے کہ مہرگل کو دوزخ کے سب سے
نیچے طبقے میں پھینک دیا گیا جہاں وہ صدیوں تک انہی
سخت عقوبتوں کے چکر میں رہے گا۔“ اور یہی روایت
غمازی کرتی ہے کہ مذکورہ بالا تمام بیان میں مخالفانہ رنگ آمیزی
سے کام لیا گیا ہوگا؛

مگر مہرگل دوزخ میں گیا ہو یا جنت میں، ہمیں اس
مقام پر جو کچھ یاد رکھنا چاہئے وہ یہ ہے کہ مہرگل کی
وفات ۳۳۵ء یا اس کے قریب زمانے میں واقع ہوئی،
جب کہ ہونوں کی طاقت میں ہر طرف زوال کے آثار

نودار تھے یہ مذکورہ بالا سن کے تقریباً پچیس برس بعد ترکوں نے ان کی صدر حکومت کا بھی قلع قمع کر دیا جس کا اوپر اشارہ ذکر آچکا ہے۔ ہندوستان میں ان کی قوت غالباً ہرنگل کے مالوے سے فرار ہوتے وقت ہی کمزور ہو گئی تھی اور کچھ باقی تھی تو اس کے بعد اس قوم کے جو لوگ مختلف اقطاع ہند میں آباد ہو گئے تھے وہ بہت جلد اہل ہند کے ساتھ گھل مل کے اپنا نسلی امتیاز کھو بیٹھے اور تھوڑے ہی عرصے کے بعد ہندوستان کی علمی زبان میں اس لفظ کا مفہوم تک بدل گیا۔

جس دھرم

اس ضمن میں باب ختم کرنے سے پہلے مالوے کے راجہ ”یشودھرم“ یا جس دھرم کے متعلق اتنا لکھنا ضروری ہے کہ مالوے میں اس کے تین کتبے ملے ہیں جس میں نہ صرف ہونوں پر مذکورہ بالا فتح اس سے منسوب کی ہے بلکہ اسے تمام ہندوستان کا فرماں روا بتایا گیا ہے اور لکھا ہے کہ جو علاقے گپت خاندان کے مہاراجہ اور ہون فتح نہ کر سکے تھے جس دھرم راجہ نے انہیں بہ زور شمشیر فتح کیا، سوائے ان کتبات کے اور کہیں اس راجہ کا نام نہیں آتا اور ہونین چوننگ نے مذکورہ بالا جنگ کے حال میں اشارہ بھی اُس کا ذکر نہیں کیا۔ چنانچہ ونسنٹ اسمتھ نے اپنی ادلی ہسٹری (مطبوعہ ۱۹۱۷ء) میں ان کتبات کی صحت سے انکار کیا تھا لیکن تازہ ترین تحقیقات سے پایا جاتا ہے کہ

جس دھرم کم سے کم مالوے کا راجہ ہوگا اور مہر گل کی شکست میں غالباً سب سے زیادہ اسی کی سعی کو دخل تھا؛ (اوکس ہس - ۱۶۳)

ضمیمہ باب ہشتم

کالی داس اور اس کی شاعری

سنسکرت زبان کے سب سے نامور شاعر کالیداس کے متعلق اہل تاریخ کو کوئی بات صحت کے ساتھ معلوم نہیں۔ روایت عام کی رو سے تو وہ پہلی صدی ق م میں ہوا ہے لیکن جدید تحقیقات اسے بہت بعد کا آدمی قرار دیتی ہے؛ لاسن اور ویبر جو کہ سنسکرت علم ادب کے مستند ماہر مانے جاتے ہیں، اس کا زمانہ تیسری صدی عیسوی بتاتے ہیں؛ مشہور ہے کہ وہ راجہ ”بکرماجیت“ کے دربار کا ایک ”رتن“ تھا۔ مگر خود اس ”بکرماجیت“ کا زمانہ متعین کرنا دشوار ہے۔ اوپر ہم پڑھ آئے ہیں کہ چندرگپت ثانی نے اپنا لقب ”بکرماجیت“ رکھا تھا اور اگر کہانیوں میں جس ”بکرماجیت“ کا ذکر آیا ہے وہ یہی راجہ تھا، اور کالیداس اس کے ”نرتن“ میں داخل تھا تو پھر اس شاعر کا

زمانہ چوتھی صدی کا آخری حصہ ہو گا۔

بہر حال، وہ کسی زمانے میں ہوا ہو ”اس کے تختیوں کی قوت، اس کے بیان کی قدرت، طبیعت کی پاکیزگی اور فطرت کی دل آویزیوں سے اس کا متاثر ہونا“ وہ اوصاف ہیں جو اُسے شعراے عالم کی صفِ اول میں شمار ہونے کا مستحق بناتے ہیں۔ کم سے کم ہندوستان میں آج تک کوئی ناولگ اس کی ”شکنتلا“ اور ”دکرم اروسی“ کے پائے کا نہیں لکھا گیا، ان دونوں کے بہت سی زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں مگر کالیداس کی تصنیف میں بہترین ”شکنتلا“ ہی کو مانا جاتا ہے۔ تیسرا ڈراما ”مالوی کا کانتا“ اس درجے کی نظم نہیں۔ نہ اتنا مشہور و مقبول ہوا، نہ ”رگھو“ اور ”دکرم سمبھو“ کی تصنیف بھی کالیداس سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ دو طویل مثنویاں ہیں جن میں سے ایک راجہ رام چندر جی کے آبا و اجداد کا حال سناتی ہے اور دوسری میں خدائے جنگ ”کمار دیو“ کی ولادت کا سماں دکھایا گیا ہے۔ مگر غالباً ان سب سے زیادہ پر کیف نظم ”میگھ دت“ (یعنی ”نامبر آہر“) ہے؛ ایک دُور افتادہ شوہر عالم خیال میں بادلوں کو مخاطب کرتا ہے اور اُن کے ہاتھ اپنی محبوب بیوی کو اپنے حال کی اطلاع بھیجتا ہے۔ اور اسی کے بیان کرنے میں شاعر نے اپنی شاعری کا کمال دکھایا اور جذبات انسانی کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا ہے، موسموں پر

کالیداس نے جو چھوٹی سی نظم لکھی وہ معمولی ”بارہ ماہ“ کی قسم کی ہے باقی ”نل دے“ یا اور بہت سی شہنویاں ڈرامے وغیرہ جو اس کے نام سے مشہور ہیں، طرز بیان کے اعتبار سے بالکل مختلف ہیں اور چونکہ ”کالیداس“ نام کے اور بھی دو تین شاعر ہو گزرے ہیں لہذا یقینی طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ کس کالیداس کی تصنیف ہیں ؟

اوکس فورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر مکڈائل جن کی زبان سنسکرت پر کئی کتابیں مشہور ہیں، کالیداس کی شاعری کے بڑے مداح ہیں مگر اسی کے ساتھ ان کی رائے ہے کہ وہ بعض جگہ بہت تصنع سے کام لیتا ہے اور اس کے کلام میں وہ بے تکلفی نہیں پائی جاتی جیسی کہ وید کے قدیم اشلوکوں میں نظر آتی ہے۔ دوسرے اس کی نظم کے مختلف حصوں میں وہ تناسب نہیں جو ”اجرا“ کو ”نل“ کے ساتھ ہونا چاہئے اور قدیم یونانی اساتذہ کا خاص امتیاز تھا ؟

باب نہم

پہلی فصل - راجہ ہرش کا زمانہ

ونڈٹ اسمتھ نے اپنی قدیم ہندوستان کی تاریخ میں تین نقشے دئے ہیں اور سب سے اقبال مند راجاؤں کی حدود سلطنت دکھائی ہیں۔ چنانچہ ایک اشوک راجہ کی سلطنت کا نقشہ ہے دوسرے میں سمدرگپت کے مقبوضات دکھائے ہیں اور تیسرے میں راجہ ہرش کے یہ نقشے ایک حد تک فطنی ہیں باقی تاریخ کے طالب علم کی سب سے پہلے جس شے پر نظر پڑے گی وہ یہ ہے کہ جو بادشاہ زیادہ قدیم ہے اسی کی سلطنت زیادہ وسیع ہے۔ افغانستان کی رود ہمند سے دکن کی بینارندی تک اشوک راجہ کی حکومت تھی۔ سمدرگپت صرف زرد اور چناب کے درمیان کے علاقہ کا مالک تھا۔ ہرش کے زمانے میں وسط پنجاب کا رنگ بھی نقشے میں سادہ ہے کیونکہ شلج سے اوپر اس کی حکومت نہ تھی! کیا اس کے معنی یہ ہے کہ اہل ہند کے قوائے فطری میں زوال آگیا تھا؟

اس سوال کا بے تامل اثبات میں جواب دینے سے پہلے
قیاس آرائی کے لئے چند قابل غور پہلو نظر آتے ہیں :-
(۱) اگر یہ مان لیا جائے کہ ہندوستان کی آبادی آہستہ آہستہ

بڑھ رہی تھی تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اُس کے مختلف حصوں کی جنگی قوت میں بھی ترقی ہوئی۔ پس کہہ سکتے ہیں کہ اسی مناسبت سے ان سب کا فتح کرنا بھی دشوار تر ہوتا گیا؛

(۲) سکندر کے حملے نے ایران و ترکستان کے بادشاہوں کے سامنے گویا ایک نظیر قائم کر دی تھی کہ پھر جو مینلا اٹھتا وہ اس طرف ضرور یورش کرتا تھا اور گو ان کی فتوحات پائیدار نہ تھیں مگر اس قسم کے حملوں نے غیر قوم والوں کا راستہ صاف کر دیا تھا اور غالباً تیسری صدی قبل مسیح علیہ السلام سے تیسری صدی عیسوی تک اور دوبارہ چھٹی صدی میں ایران و ترکستان کے جتنے گروہ ہند میں آئے، نہ پہلے کبھی آئے تھے نہ (اسلامی فتوحات تک) بعد میں کبھی آئے۔ ہندوستان کے قدامت پسند باشندوں میں بار بار ان مختلف قوموں کی آمیزش اگرچہ فائدے سے خالی نہ تھی لیکن اس قومیت کے نہایت قوی عنصر یعنی اتحادِ نسل کا ناس کر دیا، جس کے بنیہ اس قدیم زمانے میں لوگوں کے خیالات کا اتحاد محال تھا اور آج بھی کچھ آسان نہیں ہے۔ اور خیالات کا متحد ہونا ہر قسم کی قومی یا سیاسی شیرازہ بندی کی پہلی شرط ہے۔ یہ نہ ہو تو پھر کسی سلطنت یا حکومت میں استحکام آ سکتا ہے نہ کوئی قوم ”قوم“ بن سکتی ہے۔ اب اگر ہمارا پہلا نتیجہ صحیح ہے کہ موریا خاندان کے بعد نووارد قوموں کے آنے سے اہل ہند کے خیالات میں سخت انتشار و اختلاف پیدا ہو گیا تھا، تو دوسرا نتیجہ بھی صحیح ہوگا کہ پھر

اس جگہ لفظ ”خیالات“ میں محسوسات و جذبات دونوں داخل ہیں؛

کوئی وسیع و مستحکم سلطنت ہندوستان میں قائم نہ ہو سکتی تھی۔ اس قول کی تائید میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب تیسری صدی عیسوی میں تیدیا یا سیتھیوں کی آمد بند ہوگئی اور ان کے آنے سے جو تلامطم پیدا ہوا تھا اُس کی موجیں ٹھہر گئیں، تو گپت خاندان کی سلطنت قائم ہوئی اور جب ہونوں کا سیلاب پھیل کر سوکھ گیا اور خیالات میں کسی قدر یکسوئی ہوئی، تو ہرش راجہ کو اپنی سلطنت قائم کرنے کا موقع ہاتھ آیا۔ لیکن چونکہ اب اختلاط نسل و خون کی وجہ سے اہل ہند میں بے حد اختلافات پیدا ہو گئے تھے، لہذا یہ سیاسی نظام زیادہ عرصے تک نہ چلا اور ہرش کی آنکھیں بند ہوتے ہی اس کی سلطنت کا شیرازہ بکھیر گیا۔

ان قیاسات کے خلاف مغربی مصنفوں نے بالعموم ہندوستان کے اسباب طبیعی کو تمام خرابیوں کی ملت گردانا ہے اور ڈریچر و ہنکل جیسے نامی انشا پردازوں نے اس بات کو ثابت کرنے میں بڑی بڑی موشگافیاں کی ہیں کہ ممالک ہند کی آب و ہوا کا یہ فطری خاصیت ہے کہ جو قوم یہاں آ کے آباد ہو اُس کے دماغی اور جسمانی قوتی میں انحطاط پیدا ہو جائے اور وہ عیش دوست اور کاہل بن جائے۔ اور ظاہر ہے کہ پھر ایسی قوم کے افراد سے کسی خاص اوالعزمی دکھانے کی یا وسیع سلطنت قائم کرنے کی امید نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اشوک دہرشس کی سلطنتوں کی وسعت میں جو فرق تھا اس کا سبب یہی سمجھنا چاہئے کہ اسباب طبیعی نے نو وارد آریوں کو رفتہ رفتہ کم ہمت اور ضعیف کر دیا۔

بہر حال، آب و ہوا نے اہل ہند ہی کو ضعیف و کمزور کر دیا ہو یا آبادی کی افزونی اور اختلافِ نسل و خون کسی بڑی سلطنت بننے کے مانع ہوئے، اس معاملے میں تو ہرش اپنے نامور پیش رو سے زیادہ خوش نصیب ہے کہ اس کے عہد کی دو کتابیں زمانے کی دست برد سے بچ گئیں اور اس کے متعلق بہت سے حالات محفوظ رہ گئے ورنہ ہندو قوم کو علم تاریخ سے جو فطری بیگانگی رہی، اس میں ہرش کے وقت تک کوئی تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ ان میں ایک تو اُس کے درباری شاعر بان کی نظم ”ہرش چرت“ ہے اور دوسری، چینی فاضل ہوئن چوئنگ کا (جو اسی عہد میں سیاحت و زیارت کی غرض سے ہندوستان آیا تھا) سفرنامہ ہے؛ بان کی رزمیہ نظم کو اگر نصرتی کے ”علی نامہ“ سے تشبیہ دی جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ دونوں شاعروں نے اپنے مدوح بادشاہوں کے واقعات زندگی شاعرانہ مبالغے کے ساتھ نظم میں لکھے ہیں۔ اس قسم کی ہم عصر تحریریں بے اصل نہیں ہوتیں اور قدیم ہندوستان کی تاریخ لکھنے میں تو وہ خاص کر بہت کارآمد سمجھی جاتی ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ اس میں شاعر اپنے مدوح کی صرف خوبیاں سراہتا ہے اور اس کے عیوب چھپا لیتا ہے اور چونکہ مکر و سازش سے کوئی کامیابی حاصل کرنا یا کسی کام میں ناکامی بادشاہ کا عیب مانی جاتی ہے، لہذا ان چیزوں کو وہ بیان نہیں کرتا۔ ”ہرش چرت“ کا بھی یہی حال ہے کہ اس میں جو واقعات بیان کئے گئے ہیں اگرچہ وہ سراسر غلط نہیں بلکہ جس

صد تک ہوئیں چونکہ کے سفر نامے سے ان کی تصدیق ممکن ہے، ان میں سے اکثر صحیح ہیں تاہم ان کے اصلی اسباب کے متعلق اطمینان نہیں ہوتا اور بہت سے شبہات پیدا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ خود ہرش کی تخت نشینی کا جائزہ ہونا ہی کسی قدر مشتبہ ہے و اس بارے میں ہم تک جو روایتیں پہنچی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ جب تھانیسر کے بہادر و جنگجو راجہ پر بھا کر کو مرض موت لاحق ہوا، تو اس کے دونوں بیٹے پنجاب کی شمال مغربی سرحد پر ہونوں سے لڑنے گئے تھے۔ مگر سپہ سالاری اور جنگ کا اصلی انتظام بڑے بیٹے راج وردھن کے ہاتھ میں تھا، اور غالباً اس کا چھوٹا بھائی ہرش وردھن جس کی عمر اس وقت پندرہ سال سے زیادہ نہ تھی صف جنگ سے بہت پیچھے سیر و شکار میں وقت گزارتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ باپ کی بیماری کی اطلاع پہلے اسی کو ہوئی اور وہ فوراً تھانیسر پہنچ گیا جہاں تھوڑے ہی عرصے بعد اس کے باپ نے قضا کی اور اہل دربار میں ایک گروہ ہرش وردھن کو راجہ بنانے کی فکر کرنے لگا۔ لیکن راج وردھن کے پائے تخت پہنچنے میں دیر نہ لگی اور شاید اس کے پہنچتے ہی اہل سازش کے حوصلے پست ہو گئے تھے کہ اُسے اپنے بہنوئی کا

تخت نشینی

۱۔ یہ شذیہ کا واقعہ ہے اور واضح رہے کہ مہرگول کی موت کے بعد سے چھٹی صدی عیسوی کے نصفِ آخر تک تاریخی واقعات بالکل تاریکی میں ہیں۔ یعنی اس پچاس ساٹھ برس کے زمانے میں ایک بات بھی ایسی نہیں معلوم ہو سکتی جو تاریخ میں قابل ذکر سمجھی جائے۔ ۱۲

انتقام لینے مالوے جانا پڑا جہاں کا راجہ اس کے بہنوی کو مار کر
 بہن لراج سری کو گرفتار کر لایا تھا۔ راج وردھن نے قاتل کو
 شکت دی لیکن دشمن کے فریب میں آ کر خود مارا گیا اور تھانیسر
 کے درباریوں نے ”بہت کچھ تامل و تذبذب کے بعد“ بادشاہی
 کے لئے نو عمر ہرش کو منتخب کیا، ہرش کو اول اول اس
 جلیل القدر منصب کے قبول کرنے میں تردد تھا اور قبول کرنے
 کے بعد بھی اس نے کئی برس تک اپنا لقب راجہ کے بجائے ”راج پتر“
 ہی رہنے دیا حالانکہ اس کا سمت اسی وقت سے شروع ہوتا ہے
 (اکتوبر ۱۹۷۷ء) تھانیسر کے درباریوں کو اس کے بادشاہ بنانے میں
 جو تامل تھا اس کا سبب تو ہرش کی کم سنی تھی لیکن ہرش کے
 تامل کی کوئی معقول وجہ شاعر نے بیان نہیں کی ممکن ہے کہ
 اس کی وجہ محض انکسار ہو اور یا یہ کہ وہ اپنی اہم ذمہ داری لیتے ہوئے
 جھجکتا ہو۔ مگر ایک امکان یہ بھی ہے کہ سلطنت کے دوسرے
 حق دار موجود ہوں اور ہرش ان کے مقابلے میں ”راجہ“ بننا
 جائز نہ جانتا ہو ۱/۲

بہر حال، تخت نشین ہوتے ہی اس کا پہلا کام یہ تھا کہ
 مصیبت زدہ بہن کی تلاش کرے جو قید سے نکل بھاگی اور
 بندھیہا پل کے جنگلوں میں خود کشی پر آمادہ تھی کہ ہرش پہنچ
 گیا۔ اور ان مصائب سے نجات پانے کے بعد راج سری کو جو

لڑائیاں اور
 فتوحات

عزت اور مرتبہ تھانیس میں حاصل ہوا، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک چینی مورخ نے اس کو ہرش کے ساتھ بادشاہی کا شریک بتایا ہے، اسی سلسلے میں ہرش کو بنگالے کے راجہ سے لڑنا پڑا جو مالوے کے راجہ کی طرف سے لڑا اور راج و دھن کے قتل کا اصلی مجرم تھا۔ لڑائی کا نتیجہ معلوم نہیں مگر قرینہ کہتا ہے کہ اول اول ہرش کو چنداں کامیابی نہیں ہوئی اور اس نے اپنی راج دھانی میں آکر ازسرنو وہ فوج مرتب کی جس میں پچاس ہزار پیادہ بیس ہزار سوار اور پانچ ہزار جنگی ہاتھی تھے، اس فوج جرّار سے وہ چھ سال تک شمالی ہند میں مسلسل جنگ کرتا رہا حتیٰ کہ مشرقی بنگالے کے سوا یہ تمام ملک اس کے زیرِ نگیں آگئے اور اُس نے دکن پر فوج کشی کی تیاری کی؛

اب وہ تمام ہندوستان کو ”ایک چھتر کے نیچے“ لانے کا آرزو مند تھا۔ اس غرض سے جنگی تیاریاں نہایت وسیع پیمانے پر کی گئیں۔ اور غالباً مفتوحہ ممالک کی ساری دولت اسی جذبہ کشور کشائی پر نثار کر دی تھی۔ کیونکہ دوبارہ جب وہ میدان میں نکلا تو اس کے جھنڈے کے نیچے ساٹھ ہزار جنگی ہاتھی اور ایک لاکھ شہ سوار جمع تھے کہ جس ملک پر بڑھے پامال کرتے نکل گئے؛ لیکن شمالی دکن میں اس لشکرِ عظیم نے سخت زک پائی۔ چالوکیہ خاندان کے سب سے نامور فرماں روا پل کین ثانی نے

نربہادی کے کنارے یہ سیلاب روک لیا اور ہرش کو طوعاً و کرہاً وہاں سے پسپا ہونا پڑا، مگر گجرات اور مغربی مالوے میں اس ناکامی کی تلافی ہو گئی جہاں کے راجاؤں نے شکستیں کھا کر فاتح کے سامنے سر اطاعت خم کر دیا (۶۴۷ء) دوسرے سال اس نے گنجام (بینی شمالی کلنگ) پر حملہ کیا اور غالباً یہ آخری فوج کشی تھی جس کے بعد اس نے تلوار ہاتھ سے رکھ دی؛

اس پیہم جنگ و جدال کا ہی ثمرہ تھا کہ ہرش نے اپنی زندگی میں نہایت وسیع سلطنت قائم کر لی جس میں راجپوتانہ و پنجاب کے سوا، نربہادی کے اوپر ہندوستان کے تمام زرخیز ممالک شامل تھے۔ لیکن اتنی مشقت اور جفاکشی نے اگر اس کے قوائے جسمانی کو قبل از وقت مضمحل کر دیا ہو تو یہ کچھ تعجب کی بات نہیں۔ اور یکپن چھپن برس کی عمر میں اس کی وفات (واقعہ ۶۴۷ء) بھی اس بات کا ثبوت ہے۔ شاید یہی سبب تھا کہ اس کے آخری چند سال صرف گیان دھیان اور امن امان کے کاموں میں صرف ہوئے اور اس نے اشوک راجہ کی طرح عبادت اور مذہبی خدمت پر کمر باندھی۔ عقائد کے اعتبار سے بھی عمر کے آخری زمانے میں وہ بودھ مت کی طرف مائل ہو گیا تھا گوشت خواری اور جانور کشی کی اس نے سختی سے ممانعت کر دی تھی اور ان احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزائے موت دے بغیر نہ چھوڑتا تھا؛ اس کے دیگر قوانین اور مذہبی جذبات کا حال اس باب کی آخری فصل میں آئے گا، اس جگہ ہرش کے ذاتی اوصاف کے متعلق اتنا لکھنا

آخری زمانہ اور
ذاتی اوصاف

ضروری ہے کہ وہ جس طرح رزم کا مرد میدان تھا اسی طرح بزمِ علم و فضل میں بھی اسے امتیاز حاصل ہے۔ صرف و نحو کی ایک کتاب اور کئی نظموں کی تصنیف اسی سے منسوب کی جاتی ہے۔ اور ایک کتبے میں اس کی خوش خطی کا نمونہ یعنی قلمی دستخط بھی رہ گئے ہیں۔ نظموں میں سب سے بہتر ”نامگانہ“ نامی ڈراما ہے اور اسے قدیم ہندوستان کے سب سے اچھے ناولوں میں شمار کرتے ہیں مگر اصل یہ ہے کہ اس بات کا ٹھیک ٹھیک فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ آیا یہ تصانیف واقعی ہرش کی تھیں یا کسی اور شخص نے خوش کرنے کے لئے اس کے نام سے منسوب کر دیں جیسا کہ اکثر ہوا کرتا ہے۔ بایں ہمہ اس کے ذوقِ علمی کی شہادت میں اتنا یقین کے ساتھ معلوم ہے کہ وہ اہل علم کا فیاض مرثیٰ اور مذہبی مباحث کے سننے کا نہایت شوقین تھا۔ اپنے آخری زمانے کے پائے تخت، قنوج، میں اس نے ایک بڑا جلسہ بھی اسی غرض سے کیا تھا کہ وہاں چینی فاضل ہوئین چونگ یا ہیون تسنگ بودھت کے محاسن بیان کرے، لیکن اس جلسے کا ذکر کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ ہم ہوئین چونگ اور اس کی سیاحت ہند کا کچھ حال بیان کر دیں۔

دوسری فصل۔ ہوئین چونگ اور اس کا سفرِ ہند

۶۷۷ء میں چین کے بادشاہ کاوٹسنگ نے ساٹھ جلدوں

میں ایک کتاب شایع کی تھی جس میں ہندوستان کے متعلق چینی
 سیاحوں کی تمام تحریروں کو جمع کیا اور چالیس نقشے لگائے تھے۔
 مقدمہ کتاب اس علم دوست بادشاہ نے اپنے قلم سے لکھا تھا۔
 لیکن افسوس ہے کہ زمانے کی دست برد سے یہ کتاب تلف
 ہوگئی اور اسی کے ساتھ کئی سیاحوں کے سفرنامے بھی ایسے
 گم ہوئے کہ اب ان کے ملنے کی کوئی امید نہیں ہے تاہم اس
 واقعے سے ظاہر ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں (جب کہ چین
 میں بودھ مت کا بڑا زور تھا) چینیوں کو ہندوستان کی سیاحت
 اور یہاں کے حالات معلوم کرنے سے نہایت دلچسپی تھی۔ ان کے
 زائرین میں سے کم از کم چھ ایسے ہیں جن کے پورے یا ادھورے
 سفرنامے اب تک محفوظ رہے اور ان میں سب سے زیادہ مشہور
 ہوئین چونگک ہوا ہے جس کے سفرنامے سے راجہ ہرش کے
 زمانے کے بہت سے حالات ہیں معلوم ہوئے؛

وہ غالباً سن ۶۳۰ء کے قریب چین خاص کے وسطی صوبے
 ہونان میں پیدا ہوا اور ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے بڑے بھائی
 کے پاس پائی جو بودھ مت کی کسی خانقاہ میں درویشانہ زندگی بسر
 کرتا تھا۔ سن بلوغ کو پہنچ کر ہوئین چونگک نے بھی یہی طرز زندگی
 اختیار کر لیا اور بہت دن تک تعلیم کے لئے چین کی خانقاہوں
 میں پھرتا رہا۔ پھر وہ ہونان کے شمالی صوبے (شنسی) کی ایک
 بڑی خانقاہ میں کچھ عرصے تک مقیم رہا اور یہاں علم و فضل
 کی بہ دولت اتنی شہرت پائی کہ اب تک اپنے ہم وطنوں میں

ولادت اور
 تعلیم

” مرشد“ یا اُستادِ شریعت کے لقب سے مشہور ہے، لیکن وہ اپنے مذہبی علم کو ہندوستان کا سفر کئے بغیر ناقص جانتا تھا اور اسے بودھ مت کا مولد دیکھنے کا بہت ارمان تھا۔ حکومت کی طرف سے اُن دنوں چین کے باہر جانے کی رعایا کو ممانعت کر دی گئی تھی۔ راستے کی دشواریوں سے بھی وہ بے خبر نہ تھا۔ بایں ہمہ زیارتِ ہند کا شوق تمام موانع پر غالب آیا اور ۶۲۹ء میں وہ تین تہا ہندوستان روانہ ہو گیا۔

ہوئیں چونگ نے اپنے سفر کے حالات اس خوبی سے لکھے ہیں کہ یہ سفر نامہ چینی زبان کے علم ادب میں نہایت ممتاز حیثیت رکھتا ہے اور اس کا فرانسیسی ترجمہ نہ صرف تاریخی معلومات بلکہ ادبی خوبیوں کے لحاظ سے بھی بہت قابل قدر مانا جاتا ہے، اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ہمارے فاضل سیاح نے اپنے مشاہدات کے ساتھ محض سنی سنائی یا معمولی روایتیں جمع نہیں کر دی ہیں بلکہ جو کچھ لکھا ہے وہ کافی تحقیقات اور غائر نظر ڈال کے لکھا ہے، ہندوستان میں وہ ترکستان و کابل کے راستے ۶۳۰ء میں پرش پور (پشاور) پہنچ گیا تھا مگر وادئے سندھ و کشمیر کی خانقاہوں میں تعلیم و زیارات نے دو برس لئے اور وہ ۶۳۲ء سے قبل ہندوستان خاص کے علاقے میں نہ پہنچ سکا یہاں اس نے سب سے پہلے متھرا اور تھانسیسیر کی سیر کی۔ پھر گنگا کے کنارے کنارے قنوج تک آیا جو اُن دنوں شمالی ہندوستان کا نہایت با رونق صدر مقام تھا، قنوج سے چل کر اُس نے بودھ مت کے مشہور مقامات کا اس طرح

سیاحت ہند

دورہ لگایا کہ اُجدھیہا، پریاگ، کوسمبھی، اور شمال میں سرادستی، کپل وستو، غرض کوئی ایسا شہر اس کی سیاحت سے نہ بچا جس میں گوتم بودھ کی کوئی یادگار موجود تھی۔ اور آخر میں گیا اور پٹنہ ہوتا ہوا شہر نالندا پہنچ گیا جہاں اس زمانے میں بودھ مت کی بہت بڑی درس گاہ تھی، اس درس گاہ میں دو سال تک زبان سنسکرت اور اپنے مذہب کے دقیق مسائل کی تعلیم حاصل کی پھر شمال میں اسام (کامروپ) اور جنوب میں ساحل کلنگ کے مشہور مقامات کی سیاحت کی پھر ۶۲۳ء کے قریب مہاراشٹر، کرناٹک، مالوے میں گھومتا ہوا غالباً دوبارہ بہار کے علاقے میں آیا اور یہاں اس کی ہرش راجہ سے ملاقات ہوئی جس کا حال آگے آتا ہے؛ اس کے بعد گجرات اور سندھ کے راستے وہ غزنی پہنچ گیا اور ۶۲۳ء میں اپنے وطن کو اسی راہ سے مراجعت کی جس سے ہندوستان آیا تھا؛

لیکن اب وہ تنہا یا گنامی کی حالت میں نہ تھا بلکہ بہت سے شاگرد، کتابوں کا ذخیرہ، قیمتی تصاویر اور نادر تہذیبات اس کے ساتھ تھے اور چین کے جس شہر میں پہنچتا تھا بڑی دھوم سے اس کا استقبال ہوتا تھا۔ خود بادشاہ نے اس کی بڑی عزت اور ملاقات کی اور یہ بھی چاہا کہ خرقہ درویشی اتار کر اب وہ خلعتِ انارت پہن لے اور سلطنت کی خدمت کرے۔ لیکن ہونین چونگ نے یہ درخواست قبول نہیں کی بلکہ اپنی پہلی خانقاہ (واقعہ صوبہ شنسی) میں چلا آیا۔ البتہ بادشاہ کے کہنے سے اُس نے

اپنے سفر کے حالات قلم بند کر دئے اور یہ دلچسپ کتاب ۱۲۸۵ء میں تکمیل کو پہنچی۔ ہندوستان سے جو سنسکرت کتابیں ساتھ لیا تھا ان میں سے کئی کا چینی میں اس نے ترجمہ بھی کیا اور باقی تمام وقت اسی قسم کے علمی اور مذہبی مشاغل میں گزار کر ۱۲۶۲ء میں وفات پائی۔

راجہ ہرش
سے ملاقات

ہندوستان میں اس کی ملاقات راجہ ہرش سے بھی ہوئی تھی اور سچ یہ ہے کہ اسی کی بہ دولت ہمیں اس زمانے کے بہت کچھ حالات معلوم ہو سکے ورنہ عہد ہرش کی کوئی باقاعدہ تاریخ نہیں لکھی گئی تھی۔ یہ راجہ ان دنوں اپنے جنگی مشاغل سے قریب قریب دست کش ہو گیا تھا اور ہوئین چوئنگ کی ملاقات کے بعد شاید ایک ہی لڑائی اور لڑا، کیونکہ یہ ملاقات ۱۲۳۲ء کے آغاز میں ہوئی تھی۔ غالباً وہ ان دنوں اپنے مشرقی صوبوں کا دورہ کر رہا تھا اور اسی سفر میں ہوئین چوئنگ کو باریابی کی عزت حاصل ہوئی۔ پھر جب اس کی عالمانہ تقریریں سُنیں تو راجہ اس پر دیسی سیاح کا گرویدہ ہو گیا اور اس نے کئی مرتبہ علمائے ہند کے ساتھ اس کے مناظرے کرائے۔ معلوم ہوتا ہے، ان مناظروں میں راجہ علانیہ اپنے چینی مہمان کی طرفداری کرتا تھا اور اس کی اہلی عنایتوں نے ہوئین چوئنگ کو اتنا محسوس بنا دیا کہ بعض غیر مذہب والے اس کی جان لینے کے درپے ہو گئے۔ یہ سن کر راجہ نے یہ عتاب آمیز اعلان شایع کیا کہ اگر ”استاد“ کو کسی نے ضرر پہنچایا تو قتل کی سزا پائے گا اور اس کی شان میں کوئی بُرا لفظ بھی زبان سے نکالا تو زبان کٹوا دی جائے گی!

پھر ہرش نے اس غرض سے کہ اس چینی فاضل کی لاجواب تقریر سے اور لوگ بھی مستفید ہوں قنوج میں ایک بڑی مجلس منعقد کی جس میں کئی ہزار بودہ، برہمن اور چینی علماء مدعو تھے۔ چونکہ راجہ کے پنجسالہ جشن کا زمانہ قریب تھا اس لئے سب خرچ گزار راجہ کے مہاراجہ بھی بلائے گئے اور اول قنوج میں ان کا مجمع ہوا، یہاں کوئی پچاس ہاتھ اونچے مینار پر گوتم بودہ کی طلائی مورت نصب کی گئی تھی۔ اس کی دوسری چھوٹی مورت کا بڑی دھوم دھام سے جلوس نکالا گیا جس میں ہرش نے سکر دیوتا کے لباس میں پتہ برداری کی اور اس کے حلیف راجہ والی کامروپ نے گس رانی کی خدمت انجام دی۔ باقی راجہ مہاراجہ ہاتھیوں پر سوار جلو میں چل رہے تھے۔ چلتے میں راجہ ہرش دنیا کے تین انمول "جواہرات" (یعنی گوتم، اس کی شریعت اور اس کی ملت) کے نام پر موتی اور سونے کے پھول پنچاور کرتا جانا تھا۔ اور بودہ مت کا یہ اتنا بڑا اعزاز تھا کہ اس شان و شوکت کو دیکھ کر برہمنوں کے دل میں نفرت و حسد کی آگ بھڑکنے لگی۔

جہاں گوتم کی بڑی مورت کے واسطے مینار بنایا گیا تھا وہیں صرف کثیر سے ایک ہنگامی خانقاہ بھی تیار کرائی تھی۔ یہ جلسہ عظیم ابھی پوری طرح ختم نہ ہوا تھا کہ برہمنوں کی سازش سے اس خانقاہ میں آگ لگی اور یہ مشکل بھائی جاسکی۔ پھر خود ہرش پر ایک شخص نے قاتلانہ حملہ کیا مگر اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہو سکا اور گرفتار کر لیا گیا۔ اُس نے اپنے جرم کا اقبال کر لیا اور پانچ سو بڑے

بڑے برہن جو اس سازش میں شریک تھے حراست میں لے لئے گئے۔ ان میں سے بعض کو موت کی سزا ملی اور باقی جلا وطن کر دئے گئے تو

ہوئین چونگ
کی رخصت

ان واقعات سے یہ بہ آسانی سمجھ میں آ سکتا ہے کہ اس عظیم الشان جلسے کا خاتمہ بے لطفی کے ساتھ ہوا ہوگا۔ یوں بھی ہمارا چینی سیاح کو وطن چھوڑے تیرہ برس ہو گئے تھے اور اب وہ جلد سے جلد رخصت ہونا چاہتا تھا مگر اپنے قدر دان میزبان کی خاطر اسے چند روز اور ٹھہرنا پڑا کہ اُس پنج سالہ جن میں شرکت کر سکے جو گنگا جمنہ کے سنگم پر منعقد ہونے والا تھا، اس جن میں ہرش نے ہر مذہب کے علماء اور فقرا کو دل کھول کر دان دیا اور کئی ہفتہ تک یہ لوگ بادشاہ کے مہمان رہے آخر میں ایک مہینے تک ہر مذہب و ملت کے مساکین و یتیموں کو خیرات تقسیم ہوتی رہی حتیٰ کہ ہرش کا تمام خزانہ خالی ہو گیا، اُس نے اپنے زیورات و لمبوسات بھی محتاجوں کو دے دئے اور آخر میں اپنی بہن سے کپڑا مانگ کر پہنا اور ”دیوتاؤں کے حضور میں سجدہ شکر ادا کیا کہ جو کچھ میرے پاس تھا آج کے دن دین کی خدمت میں خرچ ہو گیا“

ان تمام مراسم سے فارغ ہونے کے بعد اس نے ہوئین چونگ کو بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ رخصت کیا۔ وہ اور اس کا حلیف راجہ کامروپ ”استاد“ کو بہت سے تحائف دینا چاہتے تھے مگر ہوئین چونگ نے زاد راہ کے سوا کوئی چیز قبول

نہ کی اور اپنا بڑا خزانہ یعنی تبرکات کے صندوق اور سنسکرت کتابوں کے ۴۵۴ قلمی نسخے لے کر وطن روانہ ہو گیا؛

تیسری فصل - اس عہد کے عام حالات

ذاتی سوانح سے قطع نظر، ہوٹین چونگ کا سفرنامہ (۱۶۰۷ء) کوئی کی، اس عہد کے نظم و نسق اور مذہب و تمدن کی اگرچہ مختصر مگر نہایت معتبر تاریخ ہے۔ چونکہ ہرش کے بعد شمالی ہند میں طوائف الملوکی کا دور دورہ ہو گیا اور مسلمانوں کے آنے تک کوئی ایسی بڑی سلطنت قائم نہیں ہوئی جس کے مفصل یا دلچسپ حالات موجود ہوں لہذا ہندی تمدن کی اس آخری تصویر پر ایک نظر کرنا نہایت ضروری ہے اگرچہ اس کے خط و خال اتنے واضح نہ ہوں جتنے اس زمانے کے نقاد چاہتے ہیں؛

معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے نظم و نسق کے پرانے طریقوں میں کوئی فرق نہ آیا تھا اور یہ امر محض قدامت پرستی کی دلیل نہیں بلکہ اس بات کی شہادت ہے کہ حکومت کے جو سیدھے سادے اصول موریا خاندان کے زمانے سے بندھے گئے تھے وہ ہزار برس بعد بھی راجی و رعایا دونوں کی ضروریات کے لئے مناسب تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان جیسے زرعی ملک کے تمدن ہی میں عرصہ دراز تک کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ اپنے گانوں میں ہر شخص ذاتی محنت اور گانوں والوں کی تھوڑی سی مدد سے

مکمل نظم و نسق

معاش کا سامان فراہم کر لیتا ہے۔ اس کی دیہاتی ضروریات کے لئے زمین کی پیداوار اور دیہاتی دستکار کی مصنوعات کافی ہو جاتی ہیں۔ اس کی دنیا بہت محدود ہے اور وہ اسی میں قناعت و استغنا کے ساتھ اپنی زندگی گزار دیتا ہے۔ گاؤں سے باہر جانے کی یا اپنی برادری کے سوا دوسرے لوگوں سے میل جول کی اسے بہت کم ضرورت پڑتی ہے۔ لہذا اس کے لئے وضع قوانین کی مجلسوں اور نئے نئے ضابطوں کی بھی حاجت نہیں پڑتی۔

مختصر یہ کہ جہاں لوگوں کا تمدن نہ بدلے وہاں نظم و نسق کے پرانے آئین بدلنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ البتہ جہاں حکومت کی باگ مطلق العنان بادشاہوں کے ہاتھ میں ہو، وہاں بادشاہ کی ذاتی قابلیت یا نااہلی کا ملکی نظم و نسق پر بڑا اثر ہوگا۔ اور جب ہم یہ پڑھتے ہیں کہ ہرش نہایت مستعد فرماں روا تھا اور اپنے دور دست صوبوں میں اکثر دورے کرتا رہتا تھا تو ہونین چونگ نے ہندوستان کے نظم و نسق کی جو تعریفیں کی ہیں ان کے نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔ یہ ضرور ہے کہ فلہین چینی کے زمانہ سیاحت میں راتے جس قدر محفوظ تھے، اب وہ بات نہ رہی تھی اور ہونین چونگ کو کئی جگہ رہنروں نے لوٹا۔ لیکن اس کی بڑی وجہ تو یہ ہوگی کہ ہرش سے پہلے ملک میں بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں خود مختار تھیں اور آپس میں جنگ و جدال کے باعث ضرور ہے کہ سخت بد نظمی اور بد امنی پھیلی ہوئی ہو۔ مگر دوسرا سبب آبادی کی کثرت اور وسائلِ معاش کی قلت کو قرار

دے سکتے ہیں کیونکہ ہرش کی فوج میں لاکھوں آدمیوں کے بھرتی ہو جانے سے خیال ہوتا ہے کہ شاید زراعت میں کمی اور اجناس میں گزنی ہو گئی ہو اور ادھر نو مفتوح ملکوں میں جو سپاہی اب بیکار ہو گئے تھے، انہوں نے رہزنی کا پیشہ اختیار کر لیا ہوگا۔
 یوں ہم دیگر سنگین جرائم کی کمی تھی اور بعض اوقات چھوٹے چھوٹے قصور پر بھی نہایت سخت سزائیں دی جاتی تھیں، یہ تحقیقات جرائم کا یہ پرانا طریقہ ابھی تک رائج تھا کہ ملزم کو آگ میں ڈال دیتے یا زہر کھلا دیتے اور اگر اس پر کوئی اثر نہ ہو تو گویا اس کی بے گناہی ثابت ہو جاتی تھی؛

داخل شاہی کا جزو اعظم بالگداری کا روپیہ تھا اور اصولاً زیندا یا کاشنکار سے پیداوار کا چھٹا حصہ سرکار وصول کر لیتی تھی۔ دیگر محصولات بہت کم تھے اور عمال شاہی کو لوگوں کے تنگ کرنے کا زیادہ موقع نہ ملتا تھا۔ ان عمال کو تنخواہوں کی بجائے سرکار کی طرف سے جاگیریں عطا ہو جاتی تھیں اور ہوئیں چونگ نے لکھا ہے کہ وقائع نویسوں کا بھی ایک ٹکڑہ قائم تھا۔ یعنی ہر صوبے میں چند عہدہ دار اس کام پر مامور ہوتے تھے کہ ”آفات ارضی و سماوی اور واقعات نیک و بد“ اپنی کتاب میں درج کرتے رہیں، افسوس ہے کہ اس قسم کی کتاب کا کوئی نمونہ محفوظ نہیں ورنہ اہل تاریخ کے لئے اس عہد کی بہترین یادگار ہوتا؛
 راجہ ہرش اور اسی کی طرح دوسرے رئیس و راجہ اہل علم کے بڑے قدردان تھے اور علماء کی ہر جگہ عزت کی جاتی تھی۔

اس بات کی بھی شہادت ملتی ہے کہ برہمنوں میں اور بودھ مت کے فقرا میں تعلیم اور علم کا شوق عام تھا۔ بایں ہمہ اس عہد کی شاید ہی کوئی تصنیف ایسی ہوگی جسے سنسکرت کے علم ادب میں نمایاں جگہ دی جائے۔ ریاضی و ہیئت میں بھی جس کا ہندوؤں کو قدیم سے بہت شوق رہا، اس زمانے کی کوئی علمی یادگار نہیں اور مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان کے علوم کی حالت زوال پزیر نظر آتی ہے۔

فنون میں سوائے بُت تراشی کے کسی فن کی ترقی کا ثبوت نہیں ملتا۔ اس زمانے کی تصاویر تو اب محفوظ نہیں کہ فنِ نقاشی کی ترقی یا تنزل کا صحیح اندازہ کیا جاسکے لیکن جو کچھ موجود ہیں ان سے پایا جاتا ہے کہ کم سے کم یہ صنعت (ضرب سک) رُو بہ زوال تھی حتیٰ کہ ”قرونِ وسطیٰ کا ایک سکہ بھی خوبی صنعت کی بنا پر قابلِ ذکر نہیں“ البتہ ایک بُت تراشی ایسی صنعت ہے جس کو اس زمانے میں بہت فروغ حاصل ہوا، اور چھٹی ساتویں صدی عیسوی میں جس کثرت سے بُت بنے شاید پہلے کبھی نہ بنے تھے۔ اس کا سبب ظاہر ہے کہ یہی زمانہ ”بت پرستی“ کے بڑے عروج کا زمانہ تھا۔ راجہ سے پر جاتک ہر طبقے اور ہر فرقے کے لوگ مورتی پوجا کے گرویدہ تھے حتیٰ کہ بودھ مت اور جین مت کے پیشواؤں کو بھی اس طریقے کے اختیار کئے بغیر چارہ نہ رہا تھا

اور ہمد ہرش میں یہ صنم پرستی جس زور و شور اور شان کے ساتھ ہوتی تھی اس کی ایک مثال پچھلی فصل میں ہماری نظر سے گزر چکی ہے؛

اس طبع ہر فرقے میں بت پرستی پھیل جانے سے خیال ہوتا ہے کہ اُن دنوں ہند کے مختلف مذاہب میں کم سے کم اتحاد کا ایک قوی عنصر پیدا ہو گیا ہوگا اور اُن میں ایسا مذہبی اختلاف نہ ہوگا جو خدید عداوت باہمی کی صورت اختیار کرے۔ کیونکہ بت پرستی کا مشرب یقیناً نہایت وسیع ہوتا ہے اور ہونیں چوننگ نے ہرش کے خاندان یا برابر والوں کے مذہب کی نسبت جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی مذکورہ بالا قیاس کی تائید ہوتی ہے کہ ان میں کوئی تو شیو کا پرستار تھا اور کوئی بودھ مت کا پیرو ہو گیا تھا۔ بعض لوگ سوج کی پوجا کرتے تھے بعض وشنو کی۔ غرض ہر شخص آزاد تھا کہ جس دیوی دیوتا کو چاہے اپنی پرستش کے لئے مخصوص کر لے اور چاہے تو سب کی پوجا کرے، کوئی تعرض نہ کرتا تھا۔ لیکن اس رواداری کے باوجود معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو جو اب پراٹوں کو اپنی کتب مقدسہ ماننے لگے تھے بودھ مت والوں سے خدید نفرت تھی اور اس کا کبھی کبھی اظہار گشت و خون کی صورت میں ہوتا تھا؛ ہرش کے بڑے بھائی کو بنگالے کے جس راجہ نے دغا سے مارا اسی کی نسبت مشہور ہے کہ بودھ مت کا بڑا دشمن تھا

مذہب اور
اختلافات

اور اُن کی خانقاہیں منہدم کرا کے بھکشوں کو طح طرح کے آزار پہنچاتا تھا۔ اُس نے گیا میں اُس بڑ کے درخت کو بھی کھدوا کے آگ میں جلا دیا تھا جس کے نیچے گوتم کو عرفان حاصل ہوا اور جو بودھ مت والوں کی سب سے مقدس زیارت گاہ بن گیا تھا۔ بارے کچھ عرصے بعد ایک اور گدھ کے راجہ نے ازسرنو اسے نصب کیا اور کہتے ہیں کہ وہی اشوک راجہ کی نسل میں گدھ کا سب سے آخری فرماں روا گزرا ہے؛

خود راجہ ہرش آخرین بودھ مت کا سرگرم پیرو اور اس لئے برہمنوں کا محسود بن گیا تھا۔ مگر اس نے اول اول جو مذہبی خدمات انجام دیں وہ عام تھیں اور ان میں کسی خاص فرقے کا لحاظ نہیں رکھا تھا۔ چنانچہ قصبات و دیہات میں بہت سے دہرم سالے بنائے تھے جن میں ہر مذہب و ملت کا مسافر قیام کر سکتا تھا۔ سرکاری خراج سے اس کی جہانی اور بیمار ہو تو باقاعدہ علاج کیا جاتا تھا۔ اسی طرح بادشاہ کی طرف سے متعدد مندر تعمیر کرائے گئے تھے جن میں سے بعض بودھ مت والوں کے لئے تھے اور بعض میں ہندوؤں کے دیوتاؤں کی پوجا ہوتی تھی۔ گنگا جنا کے سنگم پر پانچویں سال ایک عام جشن شاہی ہوتا تھا اور اس میں بھی بلا تخصیص، ہر مذہب کے مسکین و فقرا کو دریا دلی سے خیرات تقسیم کی جاتی تھی؛ البتہ اپنے آخری عہد میں یہ بادشاہ علانیہ بودھ مت کا طرفدار ہو گیا تھا اور خزانہ شاہی کا بہت سا روپیہ اسی مذہب کی خانقاہیں اور ”ستوپے“ یعنی گنبد بنانے میں صرف ہونے لگا تھا

چنانچہ ایسی کئی ہزار عمارتوں کی تعمیر اسی سے منسوب ہے - اور
 ونٹ لکھتا ہے کہ دگھوئین چونگ کی سیاحت اور ہرش
 کے زمانے میں بودھ مت نمایاں طور پر رُو بہ زوال تھا بایں ہمہ
 اس کے بھکشو ابھی تک تعداد کثیر میں موجود تھے - چنانچہ ہمارے
 سیاح نے ان خانقاہوں میں رہنے والے درویشوں کی تعداد دو لاکھ
 کے قریب بتائی ہے اور ظاہر ہے کہ اس تعداد کثیر کی پرورش میں
 شاہانہ فیاضی اور دریا دلی دکھانے کا میدان بھی بہت وسیع تھا؛
 ارلی ہٹھری (صفحہ ۳۴۵)

ضمیمہ باب نہم

ہندوؤں کی آخری مذہبی کتابیں

پرانوں کے متعلق مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ سنسکرت زبان کے مشہور ماہر جولیس اگلنگ (پروفیسر اڈن برویونیورسٹی) کی مستند تحریر پر اکتفا کی جائے جنہوں نے ”سنسکرت“ پر انسانی کلو پیڈیا (طبع جدید) میں نہایت محققانہ مضمون لکھا ہے؛ (جلد ۲۳ صفحہ

۱۵۶ تا ۱۸۲)

پروفیسر موصوف ولسن کی کتاب ”مذہب ہنود“ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ”پران کائنات کی فلسفیانہ مگر افسانہ آمیز تاریخیں ہیں اور ان کو برہمنوں کے مختلف اور خاص خاص مقامی عقائد کی تائید میں جمع کیا گیا ہے۔ بعض اوقات انہیں ”پانچویں وید“ کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور درحقیقت ان کو ہندوستان کے برہمنوں کی کتب مقدسہ سمجھنا ایک حد تک بالکل صحیح ہوگا۔ یہ لفظ (پران) جس کے معنی پرانے کے ہیں اول اول ایسے ماقبل تاریخ افسانوں کے لئے استعمال ہوتا تھا جن میں خاص کر موجودات کے خلق ہونے کا بیان ہو۔ لیکن بعد میں ہر قسم کی پرانی روایات کے مجموعے پر اس کا اطلاق کرنے لگے۔ ایسے مجموعوں میں جو اس وقت موجود ہیں، اگرچہ برہمنوں کے اصولی عقیدے ”تری مورتی“ یعنی ذاتِ باری تعالیٰ کی

تین صورتیں (پیدا کرنے والا، برہما۔ پالنے والا، وشنو۔ فنا کرنے والا،
 قشو) تسلیم کی گئی ہیں، لیکن دراصل تاریخی دلائل سے، خاص خاص
 فرقے یا مقام کے کسی دیوی دیوتا کی عظمت دل نشین کرنا، ان کا
 مقصود ہے۔ اور اس غرض کو پورا کرنے کے لئے تالیف کرنے والوں
 نے ہر قسم کا تاریخی اور فلسفیانہ مسالا جمع کر دیا ہے جس کی بدولت
 یہ کتابیں عام معلومات کا نہایت عمدہ ذخیرہ بن گئی ہیں۔ مختلف
 شواہد سے یہ بات بخوبی ثابت ہے کہ موجودہ پران قدیم نسخوں سے
 یا تو صرف ماخوذ ہیں یا بعد کے الحاقات سے اصلی کتابوں کو
 بہت بڑھا لیا گیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ موجودہ پرانوں میں سے
 کوئی بھی ایک ہزار سال سے زیادہ زمانے کا نہیں ہے گو ان کے
 بعض حصے نہایت قدیم بلکہ عجب نہیں کہ ولادت مسیح علیہ السلام
 سے بھی کئی صدی قبل کے ہوں؛

قصص و روایات کا جہاں تک تعلق ہے پرانوں کا مضمون
 سنسکرت کی رزمیہ نظموں خاص کر ”مہا بھارت“ سے ملتا جلتا
 ہے۔ اور بہ ظاہر احوال پرانوں اور ان نظموں کے اصلی
 مؤلفین اور بعد کے ناقلین دونوں گروہوں نے انہی کثیر روایتوں
 کی بنیاد پر اپنی کتابیں مرتب کی ہیں جو عام طور پر زبان زد اور
 کم و بیش ہوتی رہتی تھیں۔ دوسرے قریب قریب تمام پران انہی
 بچوں میں بیانیہ مشنوی کے طرز پر لکھے گئے ہیں، اگرچہ مجموعی
 طور پر شاعری کے لحاظ سے وہ ان رزمیہ نظموں سے بہت کم
 رتبہ ہیں؛“

روایتِ عام کی رو سے اٹھارہ مہاپران ہیں اور اٹھارہ
 اُپ پران (اُپ بمعنی ماتحت یا فرود) اور مہاپرانوں کے تین مجموعے
 کردئے ہیں۔ پہلے مجموعے کے چھ مہاپرانوں میں وشنو کے اور چھ
 کے دوسرے مجموعے میں شوچی کے بھن ہیں۔ مگر تیسرے مجموعے
 میں برہما کی بجائے کرشن، گنیش، سوریا، وغیرہ اوتاروں کے قصے لکھے
 ہیں اور پروفیسر ہنری کا خیال ہے کہ اس مجموعے میں زیادہ تر الحاقی
 کلام ہے۔ بہر حال ان سب مہاپرانوں میں کل چار لاکھ شعر ہیں اور
 اُپ پران یا ستمل پران، جن میں دیوی دیوتاؤں کے استحالوں کی
 تاریخ بیان کی ہے ان کے علاوہ ہیں گو یہ اتنے وقیح نہیں تے

۱۔ ان پہلے چھ کے نام یہ ہیں :- وشنو ناروئے بھگوت - گارود - پرما - وراہا
 مگر نہ صرف اس مجموعے میں بلکہ تمام پرانوں میں سب سے زیادہ مقبول بھگوت پران
 کو مانا جاتا ہے اور اسی کا عام عقائد پر بہت اثر پڑا ہے تے
 ۲۔ ان چھ کے نام یہ ہیں :- تنسی - کورما - سکندما - لنگ - شو - اگنی تے

باب دہم

پہلی فصل - آزاد سرحدی ریاستیں

ہرش کی وفات کے بعد ہندوستان خاص میں جو آزاد ریاستیں قائم ہوئی تھیں ان کا اور بعض راجپوت قبائل کا ذکر کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ ہم ان ریاستوں کا کچھ حال تحریر کر دیں جو عہد ہرش سے پیشتر ہی خود مختار ہو گئی تھیں۔ پنجاب کی دو ایک چھوٹی ریاستوں کو چھوڑ کر، سندھ و کشمیر، نیپال و کامروپ (یا اسام) وہ علاقے ہیں جنہیں صحیح معنی میں اب تک ہندوستانی کہنا دشوار ہے۔ قدیم زمانے میں جب کہ آمد رفت کے جدید وسائل نہ تھے، ان بعید علاقوں کا ہندوستان خاص کی سلطنت سے علیحدہ ہو جانا کچھ بھی تعجب کی بات نہیں۔ چنانچہ سلطنت مغلیہ کے استقلال سے پہلے ان میں صدیوں سے خود مختار حکومتیں قائم تھیں، سوائے سندھ کے جسے محمود غزنوی اور پھر شاہانِ دہلی نے کئی بار فتح کیا۔ بایں ہمہ اس پر بھی اکبر کے زمانے سے قبل ہندوستان کے بادشاہوں کو کامل تسلط حاصل نہ ہو سکا تھا؛

غرض ہیوین چوئنگ جب ہندوستان آیا تو سندھ میں ایک قوی اور خود مختار سلطنت قائم تھی۔ صوبہ بلوچستان اس کا مقبوضہ تھا اور دریائے سندھ کی تمام وادئیں زیریں اُس میں داخل تھی۔

سندھ

پنجاب اور ملک سندھ کے درمیان ان دنوں ہکرائی صدی قابل تھی جو اب سوکھ گئی ہے مگر ساتویں صدی عیسوی تک سندھ کا صدر مقام آرور یا آور اسی کے بائیں کنارے پر موجودہ شہر خیرپور سے چند میل شمال میں واقع تھا۔ اس آزاد سلطنت کے حلقے سب سے زیادہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہاں خود ذات کے راجہ حکومت کرتے تھے اور ان کا مذہب بودھ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس مذہب کا یہاں زور تھا اور ہوئیں چونگ آیا ہے تو بودھ مت کے تقریباً دس ہزار علماء یا درویش سندھ میں رہتے تھے۔ لیکن ہمارے چینی ستیاج نے ان کے اخلاق و اطوار کی مذمت کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ مذہبی پیشوا عالم طور پر نیکتے اور عیش دوست ہیں۔

راجہ ہرش کا ہم عصر سندھ میں سہلس رائے تھا اور مسلمانوں نے اس ملک پر سب سے اول اسی زمانے میں حملہ کیا۔ یہ نوخیز قوم جنوبی ایران کو فتح کر کے اُدھر بڑھی تھی۔ سہلس رائے نے روکنا چاہا مگر لڑائی میں شکست کھائی اور مارا گیا۔ پھر اس کے بیٹے ساہسی نے عرب فاتحین کے مقابلے کی تیاریاں کیں اور دو سال بعد اپنے باپ کی مثل شکست کھا کے میدان میں کام آیا۔ مکران پر جو بلوچستان کا جنوب مغربی صوبہ ہے مسلمانوں کا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آخری ایام خلافت یعنی ۳۲ھ ہی میں مستقل قبضہ ہو گیا تھا لیکن سندھ خاص کی فتح عرصے کے بعد ہوئی جب کہ خود خاندان کی بجائے وہاں برہمنوں کا

ایک خاندان برسر حکومت تھا، اس خاندان کا مورث (بیچ) اصل میں راجہ ساہسی کا وزیر تھا۔ جب وہ راجہ مارا گیا تو خود بادشاہ بن بیٹھا اور چالیس برس تک حکومت کی۔ اسی کا بیٹا راجہ داہر تھا جس کے عہد میں سندھ کو عربوں نے فتح کر لیا۔ (۱۱۷۷ء)

پروفیسر وٹسن کا قول ہے کہ سنسکرت زبان کی جس قدر کتابیں اب تک دستیاب ہوئی ہیں، ان میں صرف راج ترنجینی ایسی کتاب ہے جس کو تاریخ کہنا ایک حد تک جائز ہوگا، ہم اپنی کتاب کے شروع میں اس کا حوالہ دے آئے ہیں کہ یہ کتاب شاہانِ کشمیر کے حالات میں لکھی گئی تھی۔ اس کا پہلا حصہ بارہویں صدی کے وسط میں کلہن نامی مصنف نے تحریر کیا پھر کشمیر کے اسلامی بادشاہوں کے عہد میں اس کی تکمیل (۱۱۷۷ء میں) ہوئی اور جب یہ ملک فتح ہو کر سلطنت مغلیہ میں شامل ہوا تو اکبر بادشاہ کے حکم سے راج ترنجینی کا ترجمہ فارسی زبان میں کرایا گیا اور اسی کا خلاصہ ابوالفضل نے اپنی کتاب ”آئین اکبری“ میں صیج کیا ہے؛

لیکن اس کتاب میں بھی ساتویں صدی عیسوی سے پہلے کے صحیح حالات نہیں ملتے جس پر اعتبار کیا جاسکے حالانکہ کشان خاندان میں زوال آنے کے بعد تیسری صدی عیسوی سے یہ

ریاست غالباً خود مختار ہو گئی تھی - ہوئین چونگ جب یہاں آیا ہے تو اس میں کابل و گندھارا یعنی شمال مغربی پنجاب کا پہاڑی ملک بھی شامل تھا اور بودھ مت کی بہت سی خانقاہیں تھیں۔ چنانچہ وہ دو سال تک اس ملک میں سیاحت کرتا رہا (۶۳۱ء تا ۶۳۳ء) بادشاہ وقت نے ہوئین چونگ کا جو اعزاز و اکرام کیا اس کا وہ معترف ہے لیکن اپنے سفر نامے میں اس کے نام کا کہیں ذکر نہیں کرتا۔ ونسنٹ اسمتھ صاحب کا خیال ہے کہ غالباً وہ ”کرکوٹ“ خاندان کا پہلا راجہ ڈربھہ وردھن (Durlabhavardhana) ہوگا جو ہرش کا ہم عصر گزرا ہے اور عرصہ دراز تک حکومت کرتا رہا۔ معلوم ہوتا ہے اس راجہ کے تیسرے جانشین کے زمانے میں ریاست کشمیر سلطنت چین کی باج گزار ہو گئی تھی چنانچہ آٹھویں صدی کے کشمیری راجہ بادشاہ چین سے خلعت حکومت پاتے تھے۔ انہی راجاؤں میں اللتادیت (Lalitaditya) خاص طور پر قابل ذکر ہے جس نے سندھ کے قریب قنوج کے راجہ کو شکست دی اور وادی سندھ کی کئی شمالی قوموں کو مغلوب کیا۔ لتادیت کی ایک یادگار ”مارتاند“ (یعنی سورج دیوتا) کا مندر، شہر اسلام آباد سے تین میل کے فاصلے پر اب تک سلامت ہے اور کشمیر کے فنی تعمیر کی امتیازی خصوصیات دکھاتا ہے۔ واضح رہے کہ اسلام آباد

جس کا قدیم نام انت ناگ ہے کشمیر کی آزاد ریاست کا پائے تخت تھا؛ اس راجہ کے پوتے و نیادت کی فتوحات کے بہت سے قصے راج ترنجی میں نقل کئے ہیں۔ مگر ان میں بہت مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ انہی مشرقی اور ہندوستانی فتوحات نے اس راجہ کا دماغ اس قدر خراب کر دیا ہو کہ وہ اپنی رعایا پر سخت مظالم کرنے لگا جن کا راج ترنجی کے مولف نے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ان مظالم کا سبب دولت کی طمع تھی اور کلہن لکھتا ہے کہ جب ”بادشاہوں کو روپے کی اور مچھلی کو گدے پانی کی پیاس ہو جائے تو پھر وہ اپنے مرتبے اور مقام کا بھی کچھ خیال نہیں کرتے اور جب تک موت کے مضبوط جال میں نہ پھنس جائیں، ان کی تشنگی کسی طرح نہیں کم ہوتی!“

شاہان کشمیر
کے مظالم

للتادت پر ہی منحصر نہیں، کشمیر کے راجہ بالعموم بہت طامع بے درد اور سخت ظالم ہوئے ہیں۔ راجہ پارتنہ اپنی مفلوک الحال رعایا کو تازیانوں سے پٹواتا تھا۔ اس کا بیٹا جو ”کہیں زیادہ بد ذات“ ہوا ہے، لوگوں کو پھقوؤں سے کٹواتا تھا۔ دسویں صدی کے آخری نصف میں ددّا نامی رانی کا دور دورہ ہو گیا تھا۔ اُس نے ملک کے نظم و نسق میں اور بھی ابتری پھیلا دی۔ ددّا کے بھتیجے راجہ سنگ رام کے زمانے میں (۹۳۳ تا ۹۷۸ء) سلطان محمود غزنوی نے کشمیر پر حملہ کیا اور اُسے شکست دی۔ لیکن اس شکست کے باوجود کشمیر کی آزادی

میں کوئی فرق نہیں آیا اور یہاں کے راجہ آئرشک اپنی رعایا پر ظلم و ستم ڈھاتے رہے۔ بقول ولنٹ اسمتھ ”دنیا میں بہت کم حکم کشمیر کے ان راجہ رانیوں کی طویل فہرست کی برابری کر سکتے ہیں، جن کا طرہ امتیاز شرمناک طمع، وحشیانہ سفاکی اور بے دردانہ بد نظمی کے سوا کچھ نہ تھا“ (اولی ہسٹری صفحہ ۲۷۵)

قدیم زمانے میں ”نیپال“ کا لفظ بہت چھوٹے علاقے کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ لیکن یہ ریاست جو ہمالیہ کے دامن میں دوآب کے شمال سے بنگالے کے شمال تک قریب قریب پانچ سو میل طویل ہے، بہت قدیم سے خود مختار رہی اور دشوار گزار کوہستانی زمین ہونے کے علاوہ یہاں کے باشندوں کی قومی خصوصیات بھی ہندوستانیوں سے بالکل جداگانہ ہیں۔ ہمد اشوک میں غالباً نیپال کا جنوبی حصہ سلطنت گمہ میں داخل تھا لیکن اس کے بعد پھر سمرگپت کے زمانے تک یہاں کے تاریخی حالات کا پتہ نہیں چلتا، کشمیر کی طرح نیپال کے وقائع بھی قلم بند کئے گئے تھے اور اس مجموعے کا نام ”ووم کاوی“ ہے مگر اس کی تحریر چنداں اعتبار کے لائق نہیں ہے البتہ

۱۷ تیرھویں صدی کے اخیر میں کشمیری مسلمانوں کا ایک خاندان برسر حکومت ہو گیا تھا اور مغلوں کی فتح، یعنی قریب قریب تین سو برس تک، تک کشمیر پر یہی اسلامی بادشاہ فرماں روئی کرتے رہے اور ۱۲

سمدرگپت کے وقت میں دوبارہ اس ریاست کا ہندوستان کے ماتحت ہونا پایا جاتا ہے۔ بائیں ہمہ یہ اطاعت و خراج گزاری شاید اسی طرح برائے نام ہوگی جس طرح آج کل ہے۔ یعنی گو نیپال کے راجہ سالانہ تحائف کی صورت میں سلطنت چین کو خراج ادا کرتے ہیں، دوسری طرف انگریز سفیر بھی ان کے پائے تخت میں مقرر ہے اور بیرونی معاملات میں وہ اس کی رائے کے پابند ہیں، لیکن ان کی اندرونی خود مختاری میں کوئی فرق نہیں آیا ہے اور انگریزوں کو پائے تخت کھٹ منڈو کے سوا اندرون ملک میں جانے کی اجازت نہیں دی جاتی؛ ہوئیں چونگ آیا تو پچھوی خاندان کے راجہ نیپال پر حکومت کرتے تھے اور ان کی علمی قابلیت کی اس نے تعریف کی ہے؛

چودھویں صدی کے آغاز سے ”وم کاولی“ میں کسی قدر مفصل اور قابل اعتبار واقعات ملتے ہیں اور یہ وہ زمانہ ہے جب کہ آج تھی خاندان کا ایک راجہ سمرائوں سے بھاگ کر نیپال آیا اور بغیر دقت یہاں کا حاکم بن گیا (۱۲۲۳ء) اس کے تین جانشینوں کے بعد یہ ریاست ایک راجپوت خاندان میں منتقل ہو گئی جس میں یکے بعد دیگرے آٹھ راجہ گزرے ہیں۔ پندرھویں صدی میں آٹھویں راجہ کی اولاد نے ریاست کو چار حصوں میں تقسیم کر لیا تھا مگر ایک حصے کا حاکم لا ولد مر گیا اور خاندان کی باقی تین شاخوں میں اٹھارویں صدی (یعنی گورکھوں کی فتح کے زمانے تک) حکومت رہی؛ ۱۷۶۵ء میں گورکھوں نے اس

ریاست کا تمام علاقہ فتح کر لیا اور اب تک اسی نوٹ وارد قوم کے راجہ یہاں فرماں روائی کرتے ہیں۔

کامروپ

کامروپ کی قدیم ریاست میں قریب قریب وہ تمام علاقہ داخل تھا جو آج کل اسام، ریاست کوچ بہار اور ضلع رنگ پور میں داخل ہے۔ ”ہما بھارت“ میں یہاں کے راجہ کا ذکر آیا ہے لیکن اہل تحقیق کے نزدیک اس کے بارے میں سب سے پہلی مستند اور کارآمد معلومات راجہ سمر گپت کے اُس کتبے میں درج ہے جو اُس نے اشوک کی لائٹھ کے ایک پہلو پر کندہ کرایا تھا (قیاساً سن ۳۰۰ء) اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں سلطنت گپت کے ہمسائے میں کامروپ کی ریاست خود مختار تھی گو رسمی طور پر وہاں کا راجہ سمر گپت کا باج گزار مانا جاتا تھا؛ اس کتبے کے کئی صدی بعد دوبارہ کامروپ کا ذکر ہرمین چوننگ کے سفر نامے میں آتا ہے یہ چینی سیاح جن دنوں نالندا کی خانقاہ میں مقیم تھا تو اس کے علم و فضل کی شہرت سن کر کامروپ کے راجہ نے بہ اصرار اسے اپنے ہاں بلوایا۔ اگرچہ وہ یا اس کی رعایا میں کوئی شخص بودھ مت کا پیرو

علا گو رکھوں کا دعویٰ ہے کہ وہ نسل راجپوت ہیں اور مسلمان فاتحین کے سامنے سے مجبوراً ہٹ کر کھاکوں کی پہاڑیوں میں آجسے تھے یہاں سے وہ رفتہ رفتہ شمال میں پھیلے اور آخر اپنے راجہ پر تھو سی نرائن کے ماتحت بڑھ کر نیپال خاص پر قابض ہو گئے۔

نہ تھا، ہیوئین چونگ راجہ کی خاطر سے وہاں گیا لیکن چند ہی روز بعد راجہ ہرش نے سخت تقاضے کر کے اُسے اپنے پاس بلوا لیا، بہر حال اس چند روزہ قیام کی بدولت (۳۳۳ء) کامروپ کے کچھ حالات تاریخ میں محفوظ رہ گئے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اُن دنوں بھی یہ ریاست فرماں رواے قنوج کی باج گزار یا حلیف کی حیثیت رکھتی تھی۔ راجہ کا نام بھاسکرورن تھا مگر زیادہ تر کمار کے لقب سے مشہور ہے اور اسی سے قیاس ہوتا ہے کہ ذات کا چھتری یا راجپوت ہوگا۔

بارھویں صدی میں کامروپ یا آسام پر پال خاندان کے راجہ قابض ہو گئے تھے لیکن تیرھویں صدی کے آغاز ہی میں شمالی برا اور سرحد چین کی قوم آہوم اس ملک میں گھس آئی اور اسے اپنی مستقل ریاست بنا لیا۔ یہ قوم زبان و معاشرت اور مذہب و نسل کے اعتبار سے ”شانی“ تھی لیکن رفتہ رفتہ اُس نے ہندوؤں کے رسم و رواج اور مذہبی عقائد اختیار کر لئے اور ۱۶۵۵ء میں ان کا راجہ چینگ نا باضابطہ ہندومت کے دائرے میں داخل ہو گیا، مسلمانوں نے اس ملک پر وقتاً فوقتاً جو حملے کئے اُن کا ذکر اپنی جگہ پر آئے گا لیکن یہ بالعموم تاریخی مہمیں تھیں اور ان کے بھیننے کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ اہل اسم کو ان کی قزاقانہ یورشوں کی سزا دی جائے۔ بڑی آب و ہوا کثرت باران، دشوار گزار پہاڑی مقامات ہونے کی وجہ سے مسلمان اس دور دست حصہ ملک پر مستقل طور پر قبضہ نہ رکھ سکے۔

اس کا انہوں نے کبھی پختہ ارادہ کیا؟

دوسری فصل شمالی ہندوستان کی ریاستیں

کتاب کے شروع میں ہی ہم پنجال یا پنپال قوم کا حال پڑھ چکے ہیں کہ دورِ قدیم میں یہ لوگ دریائے گنگا کے شمال و جنوب دونوں جانب پھیلے ہوئے تھے، غالباً اسی زمانے میں ان کا ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا اور گنگا ان کی حدِ فاصل تھی۔ شمالی ٹکڑے کا پائے تخت دھچھتر میں تھا جو اب رام نگر کے نام سے بریلی کے ضلع میں واقع ہے۔ جنوبی حصے کا صدر مقام کاپیلی تھا اور فرخ آباد کے ضلع میں قصبہ کپیل کو اسی قدیم راج دھانی کی یادگار بتاتے ہیں، ان میں سے پہلا شہر ہوئین چونگ کی سیاحت کے زمانے تک خاصا آباد تھا لیکن کاپیلی کی جگہ قنوج نے چھین لی تھی جو اس کے قریب ہی دریائے گنگا کے کنارے آباد ہوا اور فاہیان کے وقت میں چھوٹا سا شہر بن گیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے گپت خاندان کے زمانے میں اس شہر نے بہت ترقی کی اور ہرش کو اپنی وسیع سلطنت کے لئے اس سے بہتر صدر مقام نہ ملا۔ ہندو ساتویں صدی گویا اس شہر کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا اور اس کی سب سے معتبر شہادت ہوئین چونگ کا سفرنامہ ہے۔ کیونکہ جب یہ چینی سیاح یہاں آیا تو اس شہر میں صرف بودھ مت والوں کی سو سے زیادہ خانقاہیں تھیں جن میں

دس ہزار سے زیادہ درویش رہتے تھے۔ اور ہندومت کے مندروں کا شمار ان خانقاہوں سے بھی دگنا تھا؛ لیکن ہرش کے لاولد فوت ہوتے ہی جب سلطنت میں بد نظمی پھیلی تو قنوج پر اس کے وزیر راجن نے غاصبانہ قبضہ کر لیا اور اسی کے حکم سے چینی سفیر پر جو ہرش کے دربار کا معزز مہمان تھا ہندی سپاہیوں نے حملہ کیا۔ اس حملہ کی کوئی خاص وجہ ہمیں معلوم نہیں لیکن اسی بدسلوکی کا بدلہ لینے کی غرض سے تبت کے راجہ نے جسے چینی شہزادی بیاہی تھی، قنوج پر فوج بھیجی اور سفیر مذکور نے راجن کو کئی شکستیں دے کر قید کیا اور اپنے ساتھ واپس لے گیا؛ یہ سن ۳۲۹ء کا واقعہ ہے اور اس کے بعد راجہ جس ورمین (Yasovarman) کے عہد تک قنوج کا کہیں نام نہیں آتا؛

راج ترمذی کی روایات کے مطابق جس ورمین کو کشمیر کے راجہ للتادت نے شکست دے کر معزول کر دیا تھا۔ جس کا ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں۔ لیکن اس راجہ کا عہد اور کسی لحاظ سے قابل ذکر ہو یا نہ ہو اس اعتبار سے ضرور یادگار ہے کہ بھو بھوتی (Bhavabhuti) جیسا نامی شاعر اسی زمانے میں ہوا اور اس کی زندگی کا بڑا حصہ دربار قنوج ہی میں گزرا۔ بھو بھوتی نے تین ناولک لکھے ہیں اور پہلے دو (یعنی ” مہابیر چرت ” اور ” اتر رام چرت ”) میں گویا راماین کی ٹنوی کو ڈراما کا لباس پہنا دیا ہے۔ ان دونوں کے سات سات پاٹ (یا ایکٹ) ہیں۔

بھوتی اور
اک پتی۔

مگر تیسرے یعنی ”مالتی مادھو“ کے دس پاٹ رکھے ہیں اور اس میں روز مرہ کی خانگی زندگی کو دکھایا ہے۔ مالتی اور مادھو جن کا یہ قصہ ہے دو ہمسایہ بادشاہوں کے ذبیروں کی اولاد میں تھے اور ان کی بچپن ہی میں نسبت قرار پاگئی تھی۔ لیکن مالتی کے باپ کو اس کا آقا مجبور کرتا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کا رشتہ اس کے ایک منظور نظر مصاحب سے کر دے جو بہت بد صورت اور بوڑھا تھا۔ چنانچہ راجہ کے اصرار نے مالتی اور مادھو کو عرصے تک فراقی دائی کی فکر میں مبتلا رکھایا۔ اس قصے کے بیان کرنے میں شاعر نے سچے جذبات کی بہت پُر اثر تصویر کھینچی ہے اور جا بہ جا نہایت جوش انگیز (اگرچہ کسی قدر محال) واقعات دکھائے ہیں جو ہندوستان کے نقادان فن کے نزدیک یہ شاعر نہ صرف کالیداس کا ہم پلہ ہے بلکہ ”اتر رام چرت“ میں اس پر بھی سبقت لے گیا ہے xxx تغزل میں گو اس کا مرتبہ واقعی بلند ہے تاہم نالک نوبیس شاعر کی حیثیت سے وہ کالیداس کی برابری نہیں کر سکتا۔ ان دونوں کی شاعری میں نہایت نمایاں فرق یہ ہے کہ کالیداس قلبِ انسانی کے نازک حسیات اور خوش و بُراں دہقانی زندگی کی مصوری کا دل دادہ ہے اور بھو بھوتی انسانی طبیعت اور نطرت کے زیادہ پُر بیت پہلو دکھانے پر مائل ہے۔ دوسرے شستہ اور پر لطف ہونے کے باوجود اُس کا کلام کالیداس کے مقابلے میں، زیادہ تصنع آمیز اور طویل معلوم ہوتا ہے اور اس میں اُن قیود و قواعد کی بے حد پابندی کی گئی ہے جو نالک

نویسی کے نظری ماہروں نے گھڑ بیٹے تھے پ، (انسائی کلو۔ جلد ۲۴ ص ۱۴۳)

ایسے باکمال ہم عصر کے مقابلے میں واک پتی کو اگر کوئی امتیاز حاصل ہے تو اس بات میں کہ وہ پراکرت کا شاعر ہے اور اس زبان میں صرف دو ہی شاعروں نے رزمیہ مثنویاں لکھی ہیں جن میں واک پتی کی ”گودوبا“ تاریخی حیثیت رکھتی ہے کہ اس میں جس دھرم کی بنگالے پر فوج کشی اور فتوحات کا بیان ہے پ، جس دھرم کے بعد آٹھویں صدی کے خاتمے تک اس کے دو جانشین کیے بعد دیگرے فتوح میں تخت نشین ہوئے لیکن پہلے کوشمیر کے راجہ نے دوبارہ شکست دے کر معزول کر دیا اور دوسرے سے بنگالے کے راجہ دھرم پال نے حکومت چھین کر ایک اور شخص چکراجیہ کے سپرد کر دی۔ یہ غالباً تنوج کے شاہی خاندان سے تھا اور اس کی بادشاہی کو سب ہمسایہ راجاؤں نے باضابطہ تسلیم کر لیا تھا۔ لیکن اس کی تقدیر میں بھی وہی تلخ کامی لکھی تھی کہ آٹھویں صدی میں راجپوتانے کے ایک راجہ ناگ بھٹ نے اس پر حملہ کیا اور سلطنت چھین لی پ،

بند کے راجہ

ناگ بھٹ دراصل گرجروں (یا گورجروں) کی قوم کا راجہ تھا اور یہ قوم جس کے بہت سے لوگ آج بھی ہندوستان میں موجود ہیں، غالباً باہر سے یہاں آئی اور ہونوں کی ہم نسل نہیں تھی تو کم سے کم عرصے تک ان کے ساتھ ضرور رہی۔ اس کا ایک گروہ ”پرہار“ یا ”پرتہہار“ (Pratibhara) کہلاتا تھا اور

گجروں کی حکومت

شاید چھٹی صدی عیسوی میں انہوں نے مل کر راجپوتانے کے وسطی علاقے میں ایک خود مختار سلطنت قائم کی تھی جس کا پایہ تخت بھیل مال (یا بھین مال) کوہ آبو سے کوئی پچاس میل شمال مغرب میں واقع تھا۔ اسی سلطنت کی ایک شاخ بڑوچ میں تھی اور بعد میں ”پرہیار“ نامی گروہ نے بندھیل کھنڈ میں اپنی ریاست الگ بنائی جس کا صدر مقام موہنہی موجودہ چھترپور کے قریب تھا؛

بہر حال، فخمند راجہ کو قنوج لینے کے بعد شاید اپنے پرانے پائے تخت میں رہنا پسند نہ آیا اور اس نے گنگا کے کنارے کو راجپوتانے کے ریگستان پر ترجیح دی۔ چنانچہ سلطان محمود غزنوی کے حملوں کے وقت تک اسی ناگ بھٹ کی اولاد قنوج میں حکومت کرتی تھی۔ گر ناگ بھٹ اور اس کے بیٹے رام دیو (یا رام بھدر) کے متعلق سوائے اس کے کچھ معلوم نہیں کہ وہ غالباً ۱۱۵۰ء سے ۱۱۷۰ء تک راج کرتے رہے۔ البتہ ان کے جانشین راجہ مہمیر کو جو بھوج کے لقب سے مشہور ہے، بہت عروج حاصل ہوا اور اُس نے قریب قریب پچاس برس تک اقبال و کامرانی کے ساتھ بادشاہی کی۔ اس کی حدود سلطنت معلوم کرنے کا کوئی معتبر ذریعہ نہیں ہے لیکن قرائن کہتے ہیں کہ اودھ سے جنوب مشرقی پنجاب تک اور مغرب میں راجپوتانہ و گجرات اس کی قلمرو میں داخل تھے۔ گویا شمال مغربی سرحد پر دریائے ستلج تھا تو جنوب مغربی سرحد زردا تک وسیع تھی اگرچہ مالوے کے

مشرقی علاقہ اور بندھیل کھنڈ میں علیحدہ آزاد ریاستیں موجود تھیں جن کا حال آگے آتا ہے مشرق کی طرف بنگال و بہار کے راجاؤں سے بھوج کی سرحد جا ملتی تھی۔ اور شاید کچھ عرصے کے لئے گمگدھ کی ریاست بھی قنوج کی باج گزار ہو گئی تھی۔ اس طرح بھوج اپنے زمانے میں ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست کا مالک تھا۔ اور اگر وہ سب سے بڑی نہ تھی تو کم سے کم سب سے زیادہ دولت مند اور طاقتور ضرور تھی۔ چنانچہ راجہ بھوج کی دولت اب تک شمالی ہندوستان میں ضرب المثل ہے اور اس کی جنگی قوت کے متعلق ایک عرب سیاح کا بیان ہے کہ رسالے اور شتر سواروں کی جیسی عمدہ اور جنگجو فوج بھوج کے پاس ہے، ایسی ہندوستان کے کسی راجہ ہمارا جہ کے پاس نہیں ہے۔

سکوں سے یہ بات ثابت ہے کہ بھوج و شنو دیوتا کا پرستار تھا، چنانچہ ان سب پر اسی دیوتا کے اوتار ”ادی و راہہ“ کا نام کندہ ہے۔ صورت میں یہ سکتے ساسانی روپے کی طرز پر ڈھالے جاتے تھے اور ان کا نام ”درام“ ہوتا تھا جو یونانی دراکم (ایرانی دریک) کی یادگار ہے اور بعد میں ”دام“ رہ گیا تھا۔ ہماری زبان میں ”دمڑی“ اور ”چھدم“ اسی لفظ کی ذریعات ہیں؛

پچاس برس کے قریب فرماں روائی کرنے کے بعد بھوج نے وفات پائی (۳۹۵ء) تو اس کا بیٹا ہندو پال وارث

تخت و تلج ہوا۔ اس کی تخت نشینی اور وفات (۱۶۹۷ء) کے سن صحت کے ساتھ معلوم نہیں اور نہ کوئی تاریخی واقعہ محفوظ ہے۔ البتہ اُسے اتنا فخر ضرور حاصل ہے کہ پر اکرت زبان کے دکنی شاعر راج سکھ کا شاگرد تھا جس نے چند ناولک اور فن شعر پر ایک کتاب تصنیف کی تھی جو حال میں طبع کر دی گئی ہے۔

ہند پال کے بعد پرمہار یا گوجروں کے خاندان شاہی میں کوئی ایسا راجہ نہیں ہوا جو اپنی آبائی ریاست کو کم سے کم اغیار کے حملوں سے بچا لیتا، ۱۶۱۷ء میں راشٹر کوٹ خاندان کے دکنی راجہ اندر (ثالث) نے شمالی ہند پر حملہ کیا اور ہند کے پوتے مہی پال کو شکست دی، فاتح کا خاص پائے تخت قنوج پر قبضہ ہو گیا تھا۔ لیکن گودہ زیادہ عرصے یہاں نہ ٹھہرا اور اس کے واپس جاتے ہی مغور مہی پال دوبارہ قنوج میں آ گیا، تاہم اس شکست نے ریاست کی مرکزی قوت کمزور کر دی اور غالباً اسی وقت سے گجرات وغیرہ کے صوبے راجگان قنوج کے ہاتھ سے نکلنے لگے، اور آخر میں بندھیل کھنڈ کے (چندلوں یا) چندیلوں نے انہیں حملے کر کے اور بھی کمزور کر دیا۔ بایں ہمہ پنجاب کے راجہ جے پال نے جب غزنی کی نوخیز سلطنت سے لڑائی مول لی تو اس کے حلیفوں میں قنوج کے راجہ بچے پال (Vijayapala) کی فوج بھی شریک تھی (۱۶۹۱ء) اس کے اٹھائیس انتیس برس بعد سلطان محمود غزنوی نے خاص قنوج پر حملہ

کیا تو اس وقت سبجے پال کا بیٹا بھوج کا جانشین اور یہاں کا راجہ تھا۔ مسلمان مؤرخوں نے اس کا نام رائے جے پال لکھا ہے لیکن حال میں بعض کتبات سے معلوم ہوا کہ وہ دراصل راجے پال تھا۔ سلطان محمود کی اس راجہ نے اطاعت قبول کر لی تھی اور بعد میں اسی الزام پر اپنے ہمسایوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔

ان گورجروں (یا گوروں) کے خاندان کا خاتمہ گہرواڑوں کے ہاتھ سے ہوا۔ تفصیلی حالات و اسباب کا ہمیں علم نہیں لیکن ۱۰۹۰ء میں ہم اس نئے خاندان کے راجہ چندر دیو کو قنوج کا فرماں روا پاتے ہیں۔ یہ خاندان جس کا اصلی نام ”گہروال“ ہے غالباً چندیلوں کی برادری میں داخل تھا مگر قنوج کی ریاست ملنے کے بعد اسے بہت عروج حاصل ہوا۔ خاص کر بانی خاندان کے تیسرے جانشین گوبند چندر نے بڑی قوت پائی اور تقریباً پچاس برس تک حکومت کرتا رہا (قیاساً ۱۱۰۰ء تا ۱۱۶۰ء) اسی راجہ کا پوتا جے چند یا جے چندر ہوا ہے جس کی پرتھی راج سے عداوت کے قصے مشہور ہیں۔ پرتھی راج کی شکست اور مسلمانوں کے دلی پر قابض ہونے کے بعد جے چند نے بڑے پیمانے پر جنگ کی تیاری کی تھی اور اسے دعویٰ تھا کہ مسلمانوں کو اپنی حدود مملکت میں قدم نہ رکھنے دیجنا لیکن جب دریائے جمنہ کے کنارے چندر اوڑ (ضلع اٹاواہ) کے میدان میں مقابلے کی نوبت آئی تو جے چند کے لشکر عظیم کو سخت شکست ہوئی وہ

گہرواڑوں
کی حکومت

خود مارا گیا اور اس کی ریاست مسلمانوں کے قبضے میں آگئی -
 (۱۱۹۴ء) بگہرواڑ خاندان کے بہت سے راجپوت سردار قنوج
 سے نکل کے راجپوتانے کے بیابانوں میں پناہ گزین ہوئے اور
 یہاں انہوں نے جو دھپور کی ریاست قائم کی جو اب تک موجود
 ہے۔ مگر جو دھپور پہنچ کر ان کے خاندان کا اصلی نام بدل گیا اور
 وہ ”راٹھور“ کہلانے لگے؛

جینا اور نربدا ندی کے درمیان کا وہ علاقہ جو اب بندھیل کھنڈ
 کہلاتا ہے پہلے جھوٹی (یا ”جھاک بھوکتی“) کے نام سے موسوم
 تھا اور نویں صدی عیسوی میں غالباً یہاں گوجر (یا پریہار) قوم
 کے سردار حکومت کرتے تھے۔ ۱۱۳۱ء میں نانک چندیل
 نے انہی کے کسی رئیس کو شکست دے کر چھترپور کے قریب
 ایک چھوٹی سی ریاست قائم کی اور بندھیل کھنڈ کے چندیل راج
 اسی شخص کی اولاد میں تھے۔ قومیت کے اعتبار سے یہ راج
 گونڈ سمجھے جاتے ہیں۔ مگر انہوں نے برہمنوں کا مذہب اور وہی تمدن
 اختیار کر لیا تھا اور قرینہ کہتا ہے کہ اول اول وہ راجگان قنوج
 کے باج گزار ہوں گے۔ لیکن دسویں صدی کے آغاز میں جب
 ان کا قلعہ کالنجر پر قبضہ ہوا (۱۱۱۶ء) تو پھر ان کی قوت بڑھ
 گئی اور خود قنوج پر دست تصرف دراز کرنے لگے۔ اب ان کی
 حدود ریاست جینا کے کنارے تک وسیع ہو گئی تھیں اور اس
 میں تین بڑے بڑے شہر تھے: مہوبا، کچھورا اور کالنجر جہاں

اس خاندان کے راجاؤں نے بہت سی عمارتیں اور تالاب بنوائے تھے؛ خاص کر کھجوراہو کے عظیم الشان مندر بنانے والے کی دولت اور شوقِ تعمیر کی سب سے اچھی یادگار ہیں اور ان کی تعمیر دھنگ راجہ سے منسوب کی جاتی ہے جو چندیل خاندان کا سب سے اقبال مند فرماں روا تھا۔ پنجاب کے راجہ سبے پال نے جب امیر بکتگیں کے سفیروں کو لاہور میں قید کیا اور امیر موصوف نے فوج کشی کی تو جے پال کی مدد کے واسطے جو راجہ ہمارا راجہ فوجیں لے لے کے پنجاب گئے تھے، انہی میں دھنگ بھی شامل تھا۔ بعد میں بھی اس کے جانشین سلطان محمود غزنوی کی مخالفت میں حصہ لیتے رہے جس کا ذکر مسلمانوں کی تاریخ میں آئے گا؛ مگر بندھیل کھنڈ کے چندیل ہوں یا مالوے کے پرماتر (یا پوار) اور یا وسط ہند (چیدی) کے کلجوری، یہ سب ہندوستان کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے رئیس تھے اور اول تو ان کی مفصل و معتبر تاریخ موجود نہیں دوسرے جو کچھ واقعات محفوظ ہیں، ان کا ضروری خلاصہ ہم اپنی پہلی تاریخ (برائے میٹری کیویشن) میں لکھ چکے ہیں۔ انہیں دہرانے کی بجائے بہتر ہوگا کہ اس جگہ راجپوتی انساب کے متعلق اجمالی بحث کی جائے اور آخر میں بنگالے کے دو حکمران خاندانوں کا ذکر کر دیا جائے جنہوں نے فی الجملہ شاہانہ اقتدار حاصل کر لیا تھا؛

تیسری فصل - راجپوتوں کا نسب و بنگالے کے راج

”راجپوت“ کے لفظی معنی ہیں راجہ کا بیٹا یا امیر زادہ۔ لیکن جس طرح ”امیر زادہ“ کا مخفف ”میرزا“ آج کل ہندوستان میں قومیت کی علامت بن گیا ہے، اسی طرح ”راجپوت“ بھی ایک خاص قوم کے معنی میں مستعمل ہوا اور پھر یہ لوگ دعویٰ کرنے لگے کہ ہم سب کشتری یا چھتریوں کی ایک ہی نسل سے ہیں۔ حالانکہ اس بات کی بہت سی شہادتیں موجود ہیں کہ جو لوگ اس زمانے میں اپنے تئیں راجپوت کہتے ہیں وہ بالکل

ملا کثرت تعداد کے اعتبار سے آج کل راجپوتوں کے آٹھ بڑے بڑے قبیلے یا گوت ہیں۔

(۱) راجپور۔ ان کی تعداد سو لاکھ کے قریب ہے۔ مارواڑ (جو دھبیر) بیکانیر اور کٹی گڑھ

کے راجہ اسی قبیلے سے ہیں۔

(۲) کچھواہ۔ جے پور و آور میں برسر اقتدار ہیں۔ ۱۹ لاکھ میں ان کی تعداد ایک لاکھ سے

کچھ زیادہ تھی؛

(۳) چوہان۔ اس قبیلے کے افراد ریاست ہائے بوندی، کوٹھ اور سرہمی کے رئیس ہیں۔

کل تعداد نوے ہزار سے بھی کم ہے؛

(۴) سسودھیہا۔ اس قبیلے کی تعداد پچاس پچاس ہزار سے زیادہ نہیں۔ مگر اودے پور

میواڑ کے نامی راجہ ہمارا راجہ اسی قبیلے سے ہیں؛

(۵) جادو۔ (۶) پتوار (۷) سولنگی اور (۸) پریمار بھی مشہور قبائل ہیں مگر

ان کی تعداد کم ہے اور کوئی بڑی ریاست ان کے زیر حکومت نہیں؛ ان کے علاوہ

بقیہ صفحہ آئندہ

مختلف قوموں کی اولاد ہیں جن میں سے بعض قدیم سے ہندوستان میں آباد تھیں، بعض نسلًا آریا ہیں اور بعض بہت بعد میں ہندوستان آئیں۔

واضح رہے کہ خود درکشتری، کا لفظ کسی خاص قوم کے لئے مخصوص نہیں تھا اور گو اس قدر قدیم ہے کہ اب اس کی اصلیت نگاہ سے مخفی ہو گئی تاہم وِسنٹ اسمتھ کے نزدیک سوائے برہمنوں کے ہر ذات کا آدمی جو تختِ حکومت حاصل کر لیتا تھا، اس نام سے موسوم ہو جاتا تھا۔ پھر جب بہت سے خاندان جنھیں قسمت نے دولت و حکومت سے محروم کر دیا، بزرگوں کی یادگار میں اسی نام سے کشتری یا چھتری کہلاتے رہے تو قیاس چاہتا ہے کہ نئے حکمرانوں نے اپنے لئے ایک اور لقب (راجپوت) اختیار کر لیا تاکہ عام چھتریوں میں اور ان میں امتیاز رہے۔ لیکن دولت و حکومت آتی جاتی چیز ہے۔ دورِ وسطیٰ کے انقلابات نے ہندوستان کے بیسیوں خاندانوں کو تختِ شاہی سے محروم کر دیا اور جب مسلمان یہاں آنے تو وہ ہندو حکمران جو اب ”راجپوت“ کہلاتے تھے، یا تو ان کے باج گزار بن گئے اور یا شکستیں کھا کر انہوں نے مغربی

راجپوتوں کے اور بہت سے قدیم قبائل راجپوتانے میں اور اس کے باہر آباد ہیں اور ایک مستقل تعداد نے دین اسلام اختیار کر لیا ہے۔ ۱۲

ریگستان کی راہ لی جہاں دشمنوں کی رسائی دشوار تھی۔ انہی پناہ گزینوں کی یہ دولت یہ صحرائی ملک راجستان یا راجپوتانہ کے نام سے منقح ہوا ہے

ستیں غلام

بہر کیف اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ راجپوتوں کے تمام قبائل کسی ایک نسل سے نہیں ہیں بلکہ ان میں مختلف قوموں کے خون کی آمیزش ہے۔ اس قدر تو کپتان ٹاڈ نے بھی تحریر کیا ہے کہ راجپوت قبائل کی بعض عادات اور ادباً ان کے سیتھی یا سیدی ہونے کا پتہ دیتے ہیں۔ اور ٹاڈ وہ شخص ہے جس نے تقریباً سو برس پہلے (۱۸۲۹ء) میں اپنی مشہور کتاب ”اینٹو اینڈ این ٹی کوی ٹیز آف راجستان“ مرتب کی تھی۔ اور بھاٹوں کے گیت اور افسانے سمک اپنے ”وقائع“ میں داخل کر لئے تھے؛ تحقیقات جدید سے اس قیاس کی تصدیق ہوتی ہے اور گو کوئی تحریری سند میسر نہ آئے تاہم سیتھیوں کے بعد جو قومیں ہندوستان میں آئیں ان کے حالات کا مطالعہ کرنے سے اس قول کے باور کرنے میں کوئی شک نہیں رہتا کہ پہلے آنے والوں نے بھی اسی طرح ہندوستان کی قدیم آبادی میں اپنے واسطے جگہ نکال لی ہوگی جس طرح کہ پانچویں صدی عیسوی کے بیرونی حملہ آوروں نے رفتہ رفتہ حاصل کر لی ہے کہ اب ان میں اور دوسرے راجپوت قبائل میں کوئی امتیاز نہیں رہا۔ بلکہ ان نوارد گروہوں کو بھی اسی

قدیم نسل میں مان لیا گیا جس کی تین شاخیں چندرہنسی، سورج ہنسی، اور اگنی گل کے نام سے موسوم ہیں؛ ان پانچویں صدی کے آنے والوں سے ہماری مراد ”ہون“ قوم کے لوگ ہیں۔ مغربی ہند پر ان کی یورش کا حال پہلے ہماری نظر سے گزر چکا ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ گوجر یا گوجر قوم کے لوگ ان کے ہم نسل تھے یا کم سے کم ان کے ہمراہ باہر سے ہندوستان میں آئے اور چھٹی ساتویں صدی عیسوی میں راجپوتانے اور پنجاب میں ان کی متعدد ریاستیں قائم ہوئیں۔ ان میں سب سے مشہور ریاست بھیل مال یا بھیل مال تھی اور یہیں کا راجہ ناگ بھٹ آخرین قنوج پر قابض ہو گیا تھا (صفحہ ۲۰۶) ”اس امر کا اب قطعی ثبوت مل گیا ہے کہ راجہ بھوج اور اس کے اسلاف و اخلاف گوجروں کی ایک شاخ میں تھے جو ہرتی بار یا پرہار کہلاتی ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ راجپوتوں کا مشہور قبیلہ ”پرہار“ گوجروں ہی کی نسل سے ہے“ حالانکہ خود ”گوجروں“ کو کوئی ہندو کشتری یا راجپوت نہیں مانتا؛

ملہ اریل ہس - صفحہ ۴۱۱ -

ملہ اس جگہ یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ پنجاب کے بہت سے جاٹ اپنے تئیں ”راجپوت“ یا چھتری بتاتے ہیں (رپورٹ مردم شماری سن ۱۹۰۱ء) اور جدید اہل تحقیق کے نزدیک یہ جاٹ اور گوجر ایک ہی نسل سے ہیں مگر یہیں لوگ جاٹوں کے اس دعوے کو نہیں مانتے اور اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ تین چار صدی پہلے اس قوم کے لوگوں میں حکومت نہ تھی۔ ”راج“ حاصل ہونے کے بعد اس کے بعض خاندانوں نے ”راجپوت“ ہونے کا دعویٰ کیا ہوگا اور چونکہ یہ حال کا واقعہ ہے غالباً اس لئے

تیسری صفحہ آئندہ

چندیل اور
راشور

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ ”پرہار“ حقیقت میں گوجر ہیں اور اپنی اصلی قوم سے الگ کر کے انہیں راجپوتوں میں شامل کر لیا گیا ہے، تو پھر قدرتی طور پر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ راجپوتوں کے وہ قبیلے جو پرہاروں کے ہم نسل سمجھے جاتے ہیں، اسی طرح غیر آریا ہوں گے۔ لیکن چونکہ ان کے گوجر ہونے کی کوئی بلا واسطہ شہادت موجود نہیں لہذا اس بحث کو یہاں چھیڑنا بے محل ہوگا۔ البتہ اس امر کی عمدہ شہادتیں موجود ہیں کہ چندیل (راجپوتوں) کا ہندوستان کے قدیم گونڈوں سے قریبی تعلق تھا اور ”اسی بنا پر یہ نتیجہ نکالنا بالکل حق بجانب ہوگا کہ چندیل راجپوت درحقیقت بہار یا گونڈ قوم کے لوگ ہیں جو ہندو مذہب اور تمدن کے رنگ میں رنگ گئے اور حکومت و بادشاہی حاصل کرنے کے بعد کشتری یا راجپوت سمجھے جانے لگے۔۔۔“ (ارلی ہس۔ صفحہ ۴۱۳)

اسی طرح راشور قوم کے راجپوت جو کہ ”گہراڑوں“ کی شاخ ہیں، چندیلوں کے ہم نسل تھے جو دوآب سے نقل مکان کر کے راجپوتانے میں آئے اور اب خالص آریا نژاد راجپوت مانے جاتے ہیں۔

ہال خاندان

جس وقت ہندوستان خاص کے علاقوں میں یہ ہل چل پھی ہوئی تھی اور بعد میں سلطان محمود غزنوی کے حملوں نے

بقیہ صفحہ گزشتہ

برہمنوں نے انہیں چھتریوں کی ذیل میں داخل نہیں کیا۔

رہے ہیں امن و اطمینان میں خلل ڈال رکھا تھا، مشرقی صوبوں کی حالت نسبتاً اچھی تھی۔ آٹھویں صدی عیسوی میں وہاں کی حکومت مستقل طور پر گوپال راجہ کے خاندان میں منتقل ہو گئی اور چونکہ اس کے جانشینوں کے نام کا جزو آخر ”پال“ (Pala) ہے اس لئے یہ سب پال خاندان کے راجہ کہلاتے ہیں تو

قرآن سے پایا جاتا ہے کہ اس خاندان کے مورث اعلیٰ کو ۱۳۳ء میں بادشاہی کے لئے ”منتخب“ کیا گیا تھا مگر اس کا پتہ چلانا محال ہے کہ آیا یہ انتخاب کسی خاص شہر کے اعیان و اشراف نے کیا تھا یا اس میں تمام صوبے کے سربراہوں کے شریک تھے۔ بہر حال خاص طور پر ذکر کے قابل یہ بات ہے کہ راجہ گوپال بودھ مت کا پیرو تھا اور اس نے اُدندپور میں اس مذہب کے رویشوں کے واسطے بہت بڑی خانقاہ تعمیر کی تھی۔ (اُدندپور جو بعد میں اس خاندان کے راجاؤں کا صدر مقام ہو گیا تھا آج کل قصبہ ”بہار“ کے نام سے موسوم ہے) اور اس کے معنی یہ ہیں کہ گوتم کا مذہب ہندوستان کے اور کسی حصے میں رہا ہو یا نہ رہا ہو، اصلی وطن میں ابھی تک اس کے نام لیوا موجود تھے۔ اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ اب اس مذہب کی صورت بالکل بدل گئی تھی اور کنشک راجہ کے زمانے میں جو دو گروہ ہو گئے تھے ان کے اصولی عقائد میں بھی اب فرق آ گیا تھا؛

گوپال کے بعد دھرمپال بنگالے کا راجہ ہوا اور گوسین کا پتہ نہیں چلتا تاہم اتنا ثابت ہے کہ اُس نے کم از کم تیس برس حکومت کی اور ہندوستان خاص کے تمام علاقے غالباً اس کے زیرِ جنمیں ہو گئے تھے؛ موجودہ بھاگلپور کے علاقے میں اُس نے نہایت وسیع خانقاہ بنائی تھی اور بیان کرتے ہیں کہ اس کے اندر سو سے زیادہ معبد اور چھ بڑی بڑی درس گاہیں تھیں۔ مگر زمانے کی دست برد نے انہیں ایسا بے نشان کیا کہ اب یقینی طور پر یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ عمارت کس مقام پر تھی؛ دھرمپال کا بیٹا دیو پال اس خاندان کا سب سے بڑا فرماں روا مانا جاتا ہے کیونکہ اس کے عہد حکومت میں کلنگ اور اسام تک تمام مشرقی ہندوستان فتح ہو کر سلطنت بنگالہ میں داخل ہوا اور ایک حد تک گپت اور موریا خاندان کی یاد تازہ ہو گئی۔ اپنے باپ اڈو نادا کی طرح دیو پال بودھ مت کا پُر جوش پیرو تھا اور اس مذہب کے سب سے نامور فرماں روا اشوک کی مثل اسے بھی ”دھرم کا دند چمانے“ کی آرزو تھی۔ بلکہ مشہور ہے کہ اسی کی خاطر اُس نے غیر مذہب والوں پر فوج کشی کی اور اُن کی بہت سی بستیاں (یا قلعے) تاراج و برباد کر دیں؛ روایت عام کی یہ موجب وہ اڑتالیس برس تک حکمران رہا اور چند بڑے بڑے تالاب اس کی یادگار ہیں؛

دیو پال کے بعد پہاڑی قبیلوں نے جنھیں کام بوج ملے

جناب غلام نیرذالی صاحب ام سے ناظم آثار قدیمہ حیدر آباد، تحریر فرماتے ہیں کہ ”بھگپور“

کہتے ہیں بنگالے بریورش کی اور بہت دن تک ملک پر ان کا قبضہ رہا۔ آخر ^{۱۷۵۷ء} یا اس کے قریب راجہ جہی پال نے ان کو دفع کر کے بزدگوں کا ورثہ دوبارہ حاصل کر لیا اور شاید اسی واقعے کی بدولت اپنے ہم وطنوں میں آج تک محبوب و محترم سمجھا جاتا ہے۔ اُس کے عہد کا یہ عجیب واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ چولا خاندان کے راجہ راجندر نے ^{۱۲۳۳ء} میں شمالی ہندوستان پر فوج کشی کی اور جنوبی دکن سے گنگا کے کنارے تک بڑھ آیا۔ معلوم ہوتا ہے کام بوجوں کی یورش اور اس دکنی راجہ کے حملے ہی نے پال خاندان کو اتنا کمزور کر دیا تھا کہ تھوڑے عرصے بعد بعض جنوبی اور مشرقی صوبے اُن کے ہاتھ سے نکل گئے۔ پاباں ہمہ بارھویں صدی میں مسلمانوں کے حملہ آور ہونے کے وقت مغربی بنگال یا بہار پر اسی خاندان کے راجہ حکومت کرتے تھے اور اُن کا خاص امتیاز یہ ہے کہ غالباً سب کے سب بودھ مت کے پیرو تھے۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ) مسلمان یا کھتری وغیرہ اپنی کام بوجوں کی اولاد ہیں۔ ان کی مذہبی خدمات میں سب سے مشہور وہ سفارتیں ہیں جو جہی پال اور اس کے بیٹے نے پال کے زمانے میں تبت بھیجی گئیں۔ ان میں اس مذہب کے بعض نامور عالم بھی گئے تھے جن کی محنت اور سعی کی بدولت بودھ مت تبت میں پھیلا اور آخر میں اُسے وہ قوت حاصل ہوئی جو رومن کیتھولک مذہب کو یورپ میں حاصل ہو گئی تھی۔ چنانچہ اب تک تبت کا مذہبی پیشوا جسے "لاما" کہتے ہیں، ایک حد تک وہاں کا ملکی فرماں روا مانا جاتا ہے۔

سین خاندان

گیارہویں صدی کے اواخر میں کلنگ یا اڑیسے کے راجہ چورگنگ نے بڑی قوت حاصل کی تھی اور غالباً اسی کا ایک فوجی سردار سمٹت دیو اڑیسے کے شمال میں (موجودہ ریاست میور بھنج کے علاقے میں) ایک چھوٹی سی جاگیر کاسی پوری کا مالک بن گیا تھا۔ قیاس چاہتا ہے کہ شاید اس کی اور اُس کے دو جانشینوں کی حیثیت معمولی جاگیرداروں کی سی تھی اور وہ اپنے آقا چورگنگ کے خراج گزار سمجھے جاتے تھے۔ چونکہ پال خاندان کے راجہ والی کلنگ کے حریف تھے لہذا عجب نہیں کہ اسی کلنگ کے راجہ کے اشارے سے کاسی پوری کے یہ جاگیردار بنگالے پر تاخت تاراج کرتے ہوں۔ پھر پال خاندان کی قوت میں ضعف آیا تو سمٹت دیو کے پوتے بلال سین نے مشرقی بنگالے کا بہت سا حصہ دبا لیا اور وہاں خود مختار ریاست قائم کی۔ یہ مشہور ہے کہ اس کے کچھ بعد کا واقعہ ہے اور گو اس خاندان کو کچھ زیادہ عرصے تک حکومت کرنی نصیب نہ ہوئی تاہم بلال سین اور اس کے بیٹے لکشمین سین کا زمانہ بنگالے کی تاریخ میں اس لئے یادگار ہے کہ یہ برہمنوں کے حامی اور بودھ مت کے سخت دشمن تھے خاص کر بلال سین کے عہد حکومت میں مشہور ہے کہ بنگالے کے ہندوؤں کی ازسرنو ذات بندی عمل میں آئی اور برہمنوں کو نیپال، ارکان وغیرہ مختلف صوبوں میں بھیجا گیا کہ وہاں اپنے مذہب کی اشاعت کریں پڑ سنہ ۱۰۰۰ء میں جب بلال سین مرا تو اس کا بیٹا لکشمین سین وارث تلج ہوا۔ مسلمان

مورخوں نے اس کا نام رائے لکھنئی لکھا ہے اور اس کی نیکی کی بہت سی روایتیں مشہور ہیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام خوبیوں کے باوجود وہ ملک داری کی قابلیت نہ رکھتا تھا اور جب اسلامی سپہ سالار محمد بن بختیار خلجی صرف چند سواروں سے اچانک اُس کے محل میں گھس آیا تو وہ ننگے سر اپنے محل سے بھاگا اور ملک پر بلا دقت مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

باب یازدہم

پہلی فصل - دکن کی ریاستیں

اگرچہ بعض اوقات زبردستی کے جنوب میں تمام جزیرہ نما ہند پر ”دکن“ کا اطلاق کر دیتے ہیں، لیکن درحقیقت مسلمانوں کے عہد میں اس لفظ نے ایک حد تک اصطلاحی شان پیدا کر لی تھی اور دریائے کرشنا اس کی جنوبی سرحد سمجھا جاتا تھا جس کے سوسوا سو میل جنوب میں بڑھکر ”تامل کام“ یعنی سرزمین تامل آ جاتی ہے اور وہ پہاڑیاں جو مدراس کے شمال سے ہلالی شکل میں کوہ نیلگری تک آئی ہیں ”جنوبی ہند“ کی حدِ فاصل ہیں، مگر یاد رکھنا چاہئے کہ دریا اور پہاڑ سے بڑھ کر جو چیز کسی ملک کو دوسرے ملک سے جدا کرتی ہے وہ وہاں کے باشندوں کی قومی خصوصیات ہیں اور نسل و زبان کے لحاظ سے بھی ”تامل کام“ کے باشندے اپنے شمالی ہمسائوں سے متمیز ہیں، اسی بنا پر ہم اس فصل میں ”دکن کی ریاستوں“ سے صرف وہ ریاستیں مراد لیں گے جو کرشنا کے شمال میں تھیں۔ البتہ میسور کو جنوب میں ہونے کے باوجود دکن میں شامل کرنا پڑا کیونکہ دورِ وسطیٰ میں اس ریاست کا جو تعلق اہل شمال کے ساتھ رہا وہ جنوبی ہند

والوں سے نہ تھا؛

لیکن جزیرہ نمائے ہند کی تاریخ کو شروع کرنے سے پہلے ہمیں اس مضمون کی مشکلات پیش نظر رکھنی چاہئیں جنہیں قدیم تاریخ ہند کے مشہور مؤلف وینٹ اسمتھ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:- ”اگرچہ تحقیقاتِ جدید کی یہ بڑی کامیابی ہے کہ اُس نے جزیرہ نمائے ہند کی قدیم تاریخ کو جوڑ کر اُس کا ڈھانچہ تیار کر لیا ہے لیکن ان خالی ہڈیوں پر ہر جگہ گوشت پوست چڑھا کر مسلسل تاریخ کی صورت میں پیش کرنا محال ہے۔ ماہرین آثارِ قدیمہ کی قابلِ تعریف کوشش اور دیدہ ریزی سے جو نتائج حاصل ہوئے ہیں، اُن سے فائدہ اٹھانا گو ناگزیر ہے مگر تاریخ کے معسومی طالب علم کے لئے وہ زیادہ دلچسپ نہیں ہو سکتے اور نہ اُن کا یاد رکھنا آسان ہے۔ خاص کر جنوبی ہند کے فرماں روا اور مشائخہ کے اکثر نام ایسے طویل و ثقیل ہیں کہ اُن کا محفوظ رکھنا بہت دشوار ہے x x x x دوسرے یہاں کی ریاستیں بیرونی دنیا سے کچھ ایسی بے تعلق تھیں کہ اُن کے تفصیلی واقعات صرف مقامی تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کے کار آمد ہو سکتے ہیں۔ غرض یہ اور دیگر وجوہ ایسی موجود ہیں کہ زمانہ وسطیٰ کی ان جنوبی ریاستوں کا حال لکھنا، شمالی ریاستوں کی پیچیدہ تاریخ لکھنے سے بھی کہیں زیادہ مشکل ہے۔۔۔“

ان مشکلات کے باوجود، اس کتاب میں جنوبی ہندوستان کی بعض بڑی بڑی ریاستوں کا حال بیان کرنا ضروری ہے اور

خاندان چاولیک
کاشی

اس کا سلسلہ ہمیں آندھر خاندان سے ملا دینا چاہئے جس کے دکنی راجاؤں کا پہلے ذکر آچکا ہے۔ لیکن اس خاندان کے زوال اور خاتمے کے بعد، جس کے تفصیلی واقعات کا علم نہیں، دکن کی تاریخ کے متعلق ہماری معلومات بہت ناقص ہے اور اگر بعض چھوٹی چھوٹی ریاستوں یا حکمران خاندانوں کا پتہ چلتا بھی ہے تو ان کے صرف نام ہی نام رہ گئے ہیں۔ اور سچ پوچھئے تو عہدِ وسطیٰ کی جو کچھ بُری بھلی تاریخ موجود ہے وہ چالوکیہ خاندان کے عہدِ فروغ سے شروع ہوتی ہے؛

اس خاندان کے راجہ خالص راجپوت ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اور اس میں شک نہیں راجپوتوں کا قبیلہ ”سولنکی“ (چالوکیہ = چالوکی = سولنکی) اب تک اسی نام سے راجپوتانے میں آباد ہے چونکہ یہ سولنکی بعض شہادتوں سے پر بہاروں کے ہم نسل ثابت ہوئے ہیں، لہذا ونسنٹ اسمتھ کی رائے ہے کہ اگرچہ خاندانِ چالوکیہ غالباً

۱۸ ان میں کڑمب اور گنگ خاندان کے نام زیادہ مشہور ہیں، جن کی موجودہ بیسوں کے علاقے میں حکومتیں قائم تھیں۔ پہلے خاندان کی قدامت اشوک کی کتبات سے ثابت ہے مگر تیسری سے چھٹی صدی عیسوی تک اس کے عروج کا زمانہ سمجھنا چاہئے۔ دوسرے یعنی گنگ خاندان کے راجہ گیارھویں صدی تک میسور کے بڑے حصے پر حکمران اور دکن کی رانیوں میں حصے لیتے رہے۔ اور اسی خاندان کی ایک شاخ چھٹی صدی سے سولھویں صدی عیسوی تک ملک اڑیسہ پر فرماں روائی کرتی رہی؛

راجپوتانے سے دکن میں آیا مگر نسلاً گوجروں ہی کی اُس شاخ میں ہے جو ”چاپ“ کے نام سے موسوم تھی۔

پہر حال اس خاندان کا بانی پل کیسین (اول) Pulakesin

پل کیسین اول
”دوم“

ہوا ہے جس نے چھٹی صدی کے وسط میں شہر واتاپی پر قبضہ کیا اور ایک آزاد ریاست کی بنیاد ڈالی۔ (یہ بستی جو آج کل بادامی کہلاتی ہے موجودہ بیجاپور کے ضلع میں واقع ہے) ابتدا میں یہ ریاست بہت پھوٹی تھی مگر بانی خاندان کو ابھی سے ہمالاج ادھی راج بننے کا ارمان تھا اور بیان کرتے ہیں کہ اُس نے ”اشوہیہ“ کی رسم منائی تھی۔ اس کی وفات کا ٹھیک سن معلوم نہیں لیکن اس کے دو بیٹوں نے اپنے بعد حکومت میں حدودِ مملکت کو وسعت دی اور ساتویں صدی کے آغاز سے پہلے واتاپی ایک بڑی ریاست کا پائے تخت بن گیا۔ پل کیسین اول کا دوسرا بیٹا منگلکس مرا تو سلطنت کے لئے اس کی اولاد میں سخت خانہ جنگی بپا ہوئی اور آخر اُس کا بھتیجا پل کیسین (دہانی) سب حریفوں پر غالب آکر تخت کا مالک ہو گیا (مشئلہ) یہی وہ راجہ ہے جس نے قنوج کے راجہ ہرش کے لشکرِ عظیم کو زہرا کے کنارے روکا اور تمام شمالی دکن پر تسلط حاصل کر لیا تھا۔ کہتے ہیں کہ گجرات اور مالوے بلکہ راجپوتانہ تک کے راجہ اس سے ڈرتے تھے اور جنوبی ہند کی لڑائیوں میں بھی اول اول وہی کامیاب ہوتا رہا۔ اس کی جنگی قوت اور وفادار

فوج کا ہونین چوننگ چینی نے بھی ذکر کیا ہے جو ۱۲۱۱ء میں بل کین کے دربار میں آیا تھا۔ اور اس زمانے میں معلوم ہوتا ہے کہ اس راجہ نے ناسک یا اس کے قریب کسی مقام کو اپنا مستقر بنایا تھا جس کا غالباً بڑا سبب یہ تھا کہ جنوب مشرق میں اُس کے بھائی نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا اور ۱۱۱۵ء سے وہاں علیحدہ ریاست قائم ہو گئی تھی۔ اس حصہ ملک کو دنگی کہتے ہیں اور اس کا پائے تخت پشت پور تھا جو پتھاپورم کے نام سے گوداوری کے ضلع میں ابھی تک آباد ہے؛

مگر بل کین کو آخری اور سب سے بڑی ننگ اپنے جنوبی دشمنوں کے ہاتھ سے پہنچی اور پلوئی (Pallava) خاندان کے راجہ کرسم ورمین نے ۱۲۲۰ء میں شکست دے کر اس کا تمام ملک چھین لیا۔ غالباً اسی لڑائی میں وہ مارا گیا اور تیرہ برس تک یہ سلطنت شہر کاپچی کے پلوئی راجاؤں کے قبضے میں رہی؛ اور گو ۱۲۵۵ء میں بل کین (ثانی) کے بیٹے نے اپنی موروثی ریاست پر دوبارہ قبضہ کر لیا لیکن پلوئیوں سے ایک صدی تک برابر جنگ ہوتی رہی جس رفتہ رفتہ چالوکیہ خاندان کے راجاؤں کو کمزور کر دیا اور ۱۲۵۳ء میں ایک نئے خاندان نے ان کی رہی سہی قوت خاک میں ملا دی؛

راشٹر کوٹ

یہ خاندان راشٹر کوٹ کہلاتا ہے اور اس کا پہلا راجہ دنتی درگا ہوا ہے جس نے غالباً ۱۲۵۵ء میں واتاپی پر قبضہ کر لیا؛ دنتی درگا کو اس کے چچا کرشنا (اول) نے معزول کیا اور بعض جنگی فتوحات حاصل کرنے کے علاوہ ایلور میں وہ عظیم الشان کوہ تراشیدہ

مندر بنوایا جو "کیملاش" کے نام سے مشہور ہے۔ اس خاندان کے چوتھے اور پانچویں راجاؤں نے سلطنت کو اور وسعت دی اور کومہستان بندھیا چل سے تنگ بھدر ہندی تک تمام دکن کو فتح کر لیا۔ مگر چالوکیہ خاندان کی مشرقی شاخ (بھی تک صوبہ دکن کی مالک تھی اور خاندان راشٹرکوت (یا رٹا) کا چھٹا راجہ اموگہ ورش (Amoghavarsha) بہت دن تک اس سے اُلجھتا رہا، کہتے ہیں کہ یہ راجہ ۵۵۰ء سے شاید ۶۰۰ء تک یعنی بائیس سال سربر آرائے ریاست رہا اور اس کی دولت و قوت کا عینی گواہ ایک عرب تاجر ہے جو نویں صدی کے وسط میں ادھر آیا تھا۔ واضح رہے کہ جنوبی گجرات اور ہندوستان کے مغربی سواحل انہی دکنی بادشاہوں کے قبضے میں تھے اور چونکہ وہ اپنی رعایا کی مرزاہالی خاص کر تجارت کی ترقی میں ساعی رہتے تھے لہذا سندھ کے عرب تاجروں پر جن کے ہاتھ میں اُس وقت ہند کی بھری تجارت تھی، وہ بہت مہربان تھے، اسی تجارت کے سلسلے میں وہ عرب سوداگر (سلیمان) دکن آیا اور معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اموگہ ورش اپنا پائے تخت مانی کھیت میں منتقل کر چکا تھا جو آج کل مال کھیر کے نام سے ممالک محروسہ سرکار عالی میں داخل ہے۔

اس خاندان کا ایک اور نامی راجہ اندر (ثالث) ہوا ہے جس نے شمالی ہندوستان پر فوج کشی کی اور قنوج کے راجہ کو شکست دے کر اس کا پائے تخت چھین لیا۔ لیکن اس

اولوالعزمی اور فتوحات کے باوجود اس راجہ نے زیادہ عمر نہ پائی اور صرف دو سال سلطنت کر کے فوت ہو گیا (۹۱۶ء) راجش ٹرکوٹ خاندان کا آخری فرماں روا لگ (یا لگتہ) تھا اور اسے ۹۳۷ء میں قدیم چالوکیہ خاندان کے ایک سردار نے شکست دے کر دوبارہ اپنی سلطنت قائم کر لی۔ مگر پہلی اور دوسری سلطنت میں فرق رکھنے کی غرض سے ان متاخرین کو چالوکیانِ کلیانی کے نام سے موسوم کرتے ہیں، کیونکہ اس دوسرے خاندان کے بانی راجہ تیل یا تیلپ (Taila) نے مالک محروسہ کے موجودہ ضلع بیدر میں شہر کلیانی کو خود بسایا اور اپنا پائے تخت بنایا تھا؛

تیل نے چوبیس برس حکومت کی اور گجرات کے سوا تمام علاقہ جو پہلے کسی وقت سلطنت چالوکیہ میں داخل تھا، فتح کیا۔ جنوبی مالوے میں اس کی دھار کے راجہ منج سے کئی لڑائیاں ہوئیں اور اول اول سب معرکوں میں فتح منج کو حاصل ہوتی رہی۔ آخری مرتبہ خود منج اپنے حریف کے علاقے میں گھس آیا تھا کہ تیل کی فوجوں نے اُسے گھیر لیا شمالی حملہ آوروں کو شکست ہوئی اور اُن کا راجہ منج گرفتار ہو گیا؛ کہتے ہیں کہ اس معزز قیدی کے ساتھ تیل نے ابتدا میں شاہانہ سلوک مرعی رکھا لیکن جب اس نے منج کو بچ کر بھل جانے کی سازش کی تو پھر اُس پر بڑی سختیاں کیں اور جبر سے در در بھیک منگوانے کے بعد اس کا سر قلم کر دیا۔ (قیاساً ۹۹۵ء)

چالوکیہ خاندان کا دوسرا دور

تیل کے بیٹے ستیاس لاسے (Satyasraya) کے عہد میں چولا خاندان کے جنوبی فرماں روا راج راج (Rajaraja) نے چالوکیہ سلطنت پر چڑھائی کی۔ حملہ آوروں کی تعداد نوے ہزار بتائی گئی ہے اور حسب روایت عام انہوں نے دشمن کے ملک میں چاروں طرف تباہی پھیلا دی تھی۔ یہاں تک کہ عورتوں بچوں اور برہمنوں کو بھی نہ چھوڑا اور سخت ظلم کئے۔

پچاس برس بعد سکیش ور (اول) (Somesvara) نے اس ذلت کا بدلہ لیا اور دریائے کرشنا کے کنارے چولا کے فرماں روا کو شکست دی (۱۰۱۷ء) پھر اُس نے اس جنوبی ریاست کے پائے تخت کا بنجی کوہلہ کر کے چھین لیا اور بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ برار اور مالوے میں بھی نمایاں فتوحات حاصل کیں گویا چالوکیہ خاندان کی گزشتہ عظمت کی یاد تازہ کر دی۔ اس راجہ کی موت کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ اُسے تپ کہنہ سے شفا یاب ہونے کی امید نہ رہی تھی لہذا خود کشی کا ارادہ کیا اور شوچی کے نام کا کلمہ پڑھ کر تنگ بھدر میں کود پڑا اور ڈوب کر جان دے دی (۱۰۶۸ء)

اس کا دوسرا جانشین وکرمادتیہ (رابع) یا راجہ بکرمانک گوررا ہے جس کی رزم و بزم کے واقعات بلہن شاعر نے نظم کئے تھے اور حال میں وہ نظم دستیاب ہوئی ہے۔ اس راجہ نے اپنے بھائی سے لڑ کر سلطنت چھینی تھی اور جب دوسرے بھائی نے خود اُس پر یہی وار چلانا چاہا تو بکرمانک نے باغی کو شکست دی اور

۱۷۶۶ء سے ۱۷۶۷ء تک بڑی شان کے ساتھ فرماں روائی کرتا رہا۔ جنوبی حریفوں سے اس کی اکثر جنگ رہتی تھی۔ ان معرکوں میں قسمت مساعد رہی اور وہ کئی بار کابنچی پر قابض ہو گیا۔ اس کی ناموری کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ مشہور قانونی کتاب ”مٹاکشرا“ کا مصنف اس کا ہم عصر تھا اور کلیانی ہی میں بیٹھ کر اس نے یہ کتاب تحریر کی تھی جو بنگالے کے سوا ہندوستان کے تمام علاقوں میں آج تک ہندو قانون کی مستند کتاب مانی جاتی ہے۔

اس راجہ کے بعد چالوکیان کلیانی کی قوت میں زوال آ گیا اور تیل نالٹ کے زمانے (۱۷۵۶ء تا ۱۷۶۲ء) میں بختی یا بچل نامی سپہ سالار نے سلطنت غصب کر لی۔ ۱۷۶۳ء تک وہ اور اس کی اولاد ملک پر قابض رہی اور گو چالوکیہ خاندان کے ایک راج کھار نے پھر تھوڑا سا علاقہ چھین لیا تھا لیکن اب شمال اور جنوب سے دو نئی ریاستوں نے اس پر نزعہ کیا اور چند سال میں یہ تمام سلطنت دیوگری اور دور سمندر کے راجاؤں نے آپس میں تقسیم کر لی۔ چالوکیہ خاندان کے راجہ باقی رہے بھی تو اب ان کی حیثیت معمولی جاگیرداروں کی سی تھی

علا اس کے عہد میں ”دیرسیوا“ فرتے کی ابتدا ہوئی جو ہندومت کے اصولی عقائد سے منکر ہے اور برہمنوں سے نفرت رکھتا ہے۔ اس فرتے کے لوگ جینیوں کے بھی سخت مخالف ہو گئے تھے (اکس ہس ۲۰۳)

اور سلطنت پر جادو یا ہوئے سل خانان کے راجاؤں کا قبضہ ہو گیا تھا؛ (۱۱۹۰ء)

اس خانان (Hoysala) کو بارہویں تیرہویں صدی میں فروغ حاصل ہوا۔ اس کی راج دھانی دور سمد (علاقہ میوڑ) میں تھی اور اگرچہ شہر کی بجائے اب وہاں ہل بیڑ نامی ایک چھوٹا سا موضع رہ گیا ہے، لیکن انہیں کھنڈروں میں بعض عالیشان عمارتیں ابھی تک اپنے دولت مند بانیوں کی یادگار ہیں۔ خاص کر وہ مندر ہندوستان کے قابل دید آثار میں شمار ہوتا ہے جسے بانی خانان راجہ بلیگانے تعمیر کرایا تھا۔ یہ راجہ (۱۱۹۰ء تا ۱۱۹۳ء) چالوکیہ سلطنت کا باج گزار اور اول اول جن مت کا پیرو تھا لیکن بعد میں دکن کے مشہور ہندو عالم رامانج کی تلقین کے اثر سے وشنو کا پر جوش پرستار ہو گیا اور اسی فرقے کے لئے اس نے جا بہ جا بہت سے مندر تعمیر کرائے؛

اس راجہ کے پوتے بیر بلال (Viraballala) کے عہد میں ریاست نے بڑا عروج حاصل کیا (۱۱۹۳ء تا ۱۱۹۶ء) وہ نہ صرف اپنے ملک کا خود مختار حاکم بلکہ جنوبی ہند کا غالباً سب سے طاقتور فرمان روا گزرا ہے اور ۱۱۹۶ء تک راجگان دور سمد کا یہ اقتدار قائم رہا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ اسلامی سپہ سالار ملک کانور اور خواجہ حاجی دیوگری کے سرکش راجہ کو سزا دینے دکن پر حملہ آور ہوئے اور فتح مندوں کا یہی سیلاب خانان ہوئے سل کو بہالے گیا۔ ۱۱۹۶ء میں جب مسلمانوں نے

خانان
ہوئے سل

دوسری مرتبہ دورِ سمر کو فتح کیا تو اس خاندان کی خود مختار بادشاہی کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

دیوگیری (موجودہ دولت آباد) کی ریاست سلطنت چالوکیہ دیوگیری کے کی باج گزار تھی لیکن یہ سلطنت کمزور ہوئی تو وہاں کے رئیس خود مختار ہو گئے۔ یہ جاو (Yadava) خاندان کے راجہ کہلاتے ہیں اور تیرھویں صدی کے شروع میں ان کے راجہ سنگھن نے اس ریاست کو بہت وسیع و قوی بنا دیا تھا، لیکن یہ عروج چند روزہ تھا کیونکہ ازل تو دکن کے راجاؤں کو باہمی جنگ و جدال سے فرصت نہ تھی دوسرے تیرھویں صدی کے ختم ہونے سے پہلے مسلمانوں کی آمد شروع ہو گئی اور ۱۳۱۱ء میں یہ شمالی ریاست مستقل طور پر شاہانِ دہلی کا صوبہ بن گئی۔

دوسری فصل - جنوبی ریاستیں

ہندوستان کے سب سے جنوبی مثلث میں قدیم سے تین سلطنتوں کا پتہ چلتا ہے: پانڈیا - چیرا (یا کرالا) اور چولا۔ پہلی کا ذکر مگاس تھنیز نے اپنی کتاب الہند میں کیا ہے۔ اشوکی کتبات میں تینوں بلکہ ایک چوتھی ریاست کڑال پترا کا نام بھی آتا ہے جو سب سے قدیم تھی اور آخر میں پانڈیا کا جزو بن گئی۔ ان تینوں میں سب سے جنوبی یہی ریاست پانڈیا تھی

اور اس کے مغرب میں موجودہ کوچین تک ریاست چیرا کا علاقہ تھا۔ ساحل کورومندل اور میسور کا مشرقی علاقہ ریاست چولا میں داخل تھا اگرچہ باہمی جنگ و جدال آئے دن ان ریاستوں کی حدود کو بدلتی رہتی تھی، ان ریاستوں کے تاریخی واقعات بالکل تاریکی میں ہیں۔ اگرچہ اس بات کے ثبوت موجود ہیں کہ یہ قدیم سے متمدن ریاستیں تھیں اور یہاں کا تجارتی مال دور دور تک جہازوں میں جاتا تھا، تامل زبان میں پہلی اور دوسری صدی عیسوی کی کئی نظمیں محفوظ ہیں۔ ملیآلم زبان کا اس وقت تک رواج نہیں ہوا تھا اور جنوبی ہند میں ہر جگہ تامل بولی جاتی تھی۔ شہر مدورا اس کے قدیم علم ادب کا مولد و منشا مانا جاتا ہے جہاں شعرا کا مجمع رہتا تھا۔ اس زبان کی قدیم نظموں میں سب سے زیادہ مشہور۔ کورل، سلب دھکام اور مینے کھلے ہیں اور اب تینوں کا انگریزی میں ترجمہ ہو گیا ہے۔ کورل میں اخلاق اور صفات حسنہ کی تعلیم ہے۔ سلب دھکام (یعنی چوڑی کی داستان) اور مینے کھلے (یعنی ”عقدہ جواہر“) محض قصے ہیں جن سے اس زمانے کے مذہب اور تمدن کا پتہ چلتا ہے۔ بہت سے شعرا اور امیروں کا بھی ان میں ضمناً ذکر آ گیا ہے اور انہی کی بنا پر بعض اہل تحقیق نے جنوبی ریاستوں کے تاریخی حالات کا کچھ سراغ لگایا ہے۔ لیکن یہ حالات سین کے اعتبار سے مسلسل نہیں اور اسی لئے پانچویں صدی عیسوی تک جب کہ جنوبی ہند میں ایک نئی قوم کو عروج ہوا، درحقیقت

پالویا پلوی

ان ممالک کی کوئی تاریخ نہیں ہے
یہ نئی قوم تاریخ میں پالوا (Pallava) یا پلو کے نام
سے موسوم ہے اور ہم تلفظ کی آسانی کے لئے اسے پلوی کہنے
لگے ہیں اور اس میں یہ خیال بھی مضمحل ہے کہ غالباً یہ لوگ
پہلوی یا پارتھی نسل سے تھے۔ مگر ونسنٹ اسمتھ اس خیال کو
صحیح نہیں جانتا اور اس کے نزدیک یہ جنوبی ہند ہی کی کوئی جنگلی
قوم تھی جس نے پانچویں صدی میں ریاست چولا کا شمالی علاقہ
فتح کر لیا اور مستقل طور پر اپنی ایک ریاست علیحدہ قائم کی جس کا
پائے تخت کاچی (یا کنجی ورم) تھا۔ پھر چھٹی صدی عیسوی میں
انہیں یہ اقتدار حاصل ہوا کہ جنوبی ہند کے سب فرماں روا کسی
حد تک ان کے زیر دست ہو گئے یا کم سے کم ان سے خوف زدہ
رہنے لگے تھے۔ ایک کتبے میں سمہا وشنو دعویٰ کرتا ہے کہ اُس
نے چیرا، چولا، پانڈیا اور لنکا کے بادشاہوں کو شکست دی۔ اور
یہ پلوی خاندان کا راجہ چھٹی صدی عیسوی کے آخری ربع میں
فرماں روائی کرتا تھا۔ دیگر شواہد سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اپنے
عین عروج کے زمانے میں اس خاندان کے راجہ اڑیسے کی سرحد
سے پونیاہ یا پینیاہ ندی تک جزیرہ نمائے ہند کے مشرقی ساحل
پر قابض تھے اور مشرقی میسور اور شمالی دکن کے راجہ
ان کی سیادت تسلیم کرتے تھے۔ اگرچہ براہ راست اُن کی حکومت
صرف اس علاقے پر تھی جو آج کل ارکاٹ، مدراس، تریچنپالی
اور تنجور کے انگریزی اضلاع میں داخل ہے۔ ساتویں صدی میں

چالوکیہ خاندان کے راجاؤں نے اُن سے شمالی علاقہ (دکنی) چھین لیا تھا بایں ہمہ دو صدی تک ان کی قوت بنی رہی اور اسی زمانے میں اُن کے راجاؤں نے وہ قابل دید عمارات بنوائیں جو آج بھی اُن کی دولت و حشمت کی گواہی دیتی ہیں ؎

پلوپوں کے مشہور بادشاہوں میں پہلا ہندو رومن (اول) گزرا ہے جو غالباً ساتویں صدی کے آغاز میں فرماں روائی کرتا تھا۔ اُس نے بعض کوہ تراشیدہ منار بنوائے اور ”ہندرواڑی“ کے کھنڈر آج بھی اس کا نام یاد دلاتے ہیں ؎ یہ شہر اس نے موجودہ ارکاٹ کے کچھ شمال میں آباد کیا اور اس کے قریب بہت بڑا تالاب بنوایا تھا۔ چالوکیہ خاندان کے راجہ پل کیسن (ثانی) نے غالباً ۶۰۰ء میں اسی کو شکست دی اور علاقہ دکنی چھین لیا پہلا اس خاندان کی ایک دوسری شاخ نے اپنی ریاست علیحدہ قائم کی تھی۔ اور اس کا ذکر پچھلی فصل میں ہماری نظر سے گزر چکا ہے۔ راجہ ہندو پہلے جین مت کا پیرو تھا مگر پھر ”ویرشیو“ فرتے کا معتقد اور اپنے پچھلے مذہب کا دشمن ہو گیا۔ چنانچہ جنوبی ارکاٹ میں جینیوں کی ایک بڑی خانقاہ اُسی نے منہدم کرادی تھی ؎ مگر پلوپوں کا سب سے اقبالند فرماں روا نرسہماورمن گزرا ہے جو ہندو کا جانشین تھا اور قیاساً ۶۲۵ء سے ۶۴۵ء تک حکومت کرتا رہا۔ اُس نے چالوکیہ خاندان کے راجہ سے پچھلی ہزیمت کا بدلہ لیا اور پل کیسن کو شکست فاش دی۔ شاید اسی لڑائی میں یہ چالوکی راجہ مارا گیا اور اس کے پائے تخت پر

ہندو رومن
اور نرسہماورمن

پلوپوں کا قبضہ ہو گیا؛ (۶۶۲ء)

چینی سیاح ہوئین چوئینگ اسی راجہ کے زمانے میں اس طرف آیا اور چونکہ لنکا میں ان دنوں خانہ جنگی اور کشت و خون کا ہنگامہ برپا تھا اس لئے ہوئین چوئینگ نے وہاں جانے کا قصد ملتوی کیا اور کابچی ہی سے شمال میں واپس چلا گیا۔ اس کے سفر نامے سے معلوم ہوتا ہے کہ گو اس وقت جنوبی ہند میں بودھ مت کے درویشوں کی بہت سی خانقاہیں موجود تھیں۔ لیکن عام طور پر چین مت کے فرقے ”دگمیر“ کا زور تھا اور ”ویشیو“ کا نیا فرقہ بھی بہت تیز ترقی کر رہا تھا؛

مگر زہماورن کی سب سے بڑی وجہ شہرت یہ ہے کہ اس کے زمانے میں نقاشی اور فنِ عمارت کو فروغ ہوا۔ مائل پورم نامی شہر کی بنا اسی نے ڈالی تھی اور وہاں اب تک وہ عالیشان ہفت منادر موجود ہیں جنہیں پہاڑ تراش کر بنایا گیا تھا۔ ان کو فنِ تعمیر و کوہ تراشی کی لاجواب یادگار مانا جاتا ہے۔ اور انہیں مندروں کے اندر چٹان کو تراش کر دیوی دیوتاؤں کی صورتیں بنائی ہیں یہ کام اتنے وسیع

۱۔ ان خانقاہوں کو توڑ پھوڑ کر بعد میں ہندوؤں نے ان کی بجائے اپنے بت خانے بنائے تھے۔ حال ہی میں کئی درم کے بعض مندروں سے گوتم بودھ کی صورتیں دستیاب ہوئی ہیں اور ولسٹ اسٹھ کو یقین ہے کہ آئندہ تحقیقات سے بودھ مت کے اور بہت سے ”آکار باقیر“ اس علاقے میں دریافت ہوں گے؛

(اکس ہس - ۲۰۹)

ہیمانے پر شروع کیا گیا تھا کہ ترسہا کی زندگی میں اتمام کو نہ پہنچا اور اس کے جانشینوں کو ہمسایوں کی یورشوں نے اتنی مہلت نہ دی کہ اسے آفریک جاری رکھ سکتے دوسرے ان کے شوقِ تعمیر کے لئے اور مقامات تھے جہاں انہوں نے آٹھویں صدی کے اوائل میں بہت سی عمارتیں بنوائیں؛ مگر زوال گویا دولت و اقبال کی تاک میں رہتا ہے۔ پلوپوں کی قوت کو عروج پر پہنچے زیادہ مدت نہ ہوئی تھی کہ ان کے زوال کے آثار نظر آنے لگے؛ عروج کے زمانے میں انہوں نے اپنے ہمسایوں کو خوب ستایا تھا اب خود ان کے ستائے جانے کی باری تھی چنانچہ آٹھویں اور نویں صدی میں شمال و جنوب کے رقیبوں نے انہیں بار بار شکستیں دیں اور نویں صدی کے ختم ہونے سے کچھ عرصے پہلے چولا خاندان کے راجا آوتیا نے شکستِ فاش دے کر ان کی خود مختاری کا خاتمہ کر دیا۔ بعد میں کئی صدی تک ہم ان کے مقامی راجاؤں کا کہیں کہیں نام سنتے ہیں مگر ان کی حیثیت معمولی جاگیرداروں کی سی تھی اور غالباً سترھویں صدی کے اخیر تک اس قوم کا نام فقط تاریخ کے اوراق میں رہ گیا؛

پلوپوں کا خاتمہ، چولا خاندان کی صحیح تاریخ کا آغاز ہے یعنی صحتِ سین کے لحاظ سے آوتیا کا بیٹا پران تک (اول) پہلا راجہ ہے جس کی جانشینی اور وفات کی ٹھیک تاریخ بتائی جاسکتی ہے۔ وہ سنہ ۷۵۰ء میں تخت نشین ہوا اور بیالیس برس تک حکومت کرتا رہا۔ عہدِ حکومت کی درازی کے علاوہ اس کے اقبال مند

چولا خاندان

ہونے کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اُس نے اپنے جنوبی حریفوں کو زیر کیا۔ پانڈیا خاندان کا راجہ شکست کھا کے وطن سے نکل گیا۔ پائے تخت مدورا پر فتح مندوں کا قبضہ ہو گیا اور پران ملک نے آگے بڑھ کر لٹکا میں فوج اٹھاری؛

جنوبی ہند کی ان ریاستوں میں باہم اور لٹکا والوں کے ساتھ آئے دن لڑائی ہوتی رہتی تھی اور کبھی ایک فریق غالب آ جاتا تھا کبھی دوسرا۔ لیکن راج راج دیو Raja Raja Deva زمانے میں چولا خاندان کو جو غلبہ حاصل ہوا اس میں کم سے کم نصف صدی تک کوئی کمی نہ آئی اور اُس عہد انقلابات میں یہ کچھ معمولی بات نہ تھی؛ ان کے اس عہد عروج کا آغاز ۹۰۵ء سے ہوتا ہے جب کہ خانہ جنگی، قتل اور سازشوں کے ایک طویل سلسلے کے بعد راج راج تخت نشین ہوا اور خاتمہ ۱۰۳۵ء کو سمجھنا چاہئے جو اُس کے بیٹے راجندر کی وفات کا سال ہے؛ اس تمام مدت میں پانڈیا خاندان کے راجہ طوعاً و کرہاً اپنے شمالی ہمسایوں کی سیادت تسلیم کرتے رہے اور انہیں جنوبی ہند کی تیسری ریاست پر حملہ کرنے کی فرصت ملی؛ چنانچہ ۹۹۲ء میں راج راج نے چیرا خاندان کے ملک پر

سلطنت واضح رہے کہ ان ملکوں اور اُن کے شاہی خاندانوں کے نام ایک ہیں یعنی چیرا، چولا اور پانڈیا (یا پانڈیاں) کے لفظ کا جس طرح اُن کے خاندانوں پر اطلاق ہو سکتا ہے اسی طرح اُن کے علاقے بھی انہیں ناموں سے منسوب کر دئے جاتے ہیں؛ ۱۲

فوج کشی کی اور موجودہ کورگ کا علاقہ فتح کر لیا پھر اس نے
جانب شمال پیش قدمی کی اور ونگی کے چالوکی راجاؤں کا قلع
فتح کیا جو پلوئیوں سے چھین کر کئی صدی سے اس علاقے کے
مالک بنے ہوئے تھے۔ راج راج کی شمالی فتوحات کی حد
اڑیسے کو سمجھنا چاہئے جس کے جنوبی حصے پر اُس کا
قبضہ ہو گیا تھا، جنوب میں اس اقبالند راجہ نے لنکا
سے خرچ وصول کیا اور ایک بڑا جنگی بیسٹا بنا کے
قریب کے بعض جزائر فتح کر لئے۔ پھر بیس برس تک شمشیر
زنی اور مسلسل فتوحات کے بعد اُس نے تلوار ہاتھ سے
رکھی تو موجودہ ”احاطہ مدراس“ کا قریب قریب تمام علاقہ
سلطنت چولا میں شامل تھا؛

راج راج نے اپنی زندگی کے باقی دن امن و امان کے
مشغلوں میں بسر کئے اور اپنے صدر مقام تنجور میں وہ
عالیشان مندر تعمیر کیا جس کی دیواروں پر اس کے جنگی
کار نامے کندہ ہیں۔ یہ عمارت اب تک اپنے نامور بانی کی
یاد دلاتی ہے اور اسی ضمن میں یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہ
ہوگا کہ خود وشنو کے پرستار ہونے کے باوجود اُس نے بودھت
والوں کے لئے بھی ایک مندر تعمیر کرا دیا تھا اور پندرھویں
صدی تک لوگ اس کی زیارت کرنے آتے تھے۔ ۱۸۶۶ء
میں رومن کیتھولک پادریوں نے اُسے کس مہسپرسی کی
حالت میں دیکھ کر خود قبضہ کیا اور تڑوا کر اپنی عمارتیں

بنوائیں ۶

۱۲ راج راج کے بعد جب اُس کا بیٹا راجندر (اول) تخت نشین ہوا (۱۱۱۷ء) تو پھر جنوبی ہند کے سپاہیوں کی تلواریں جو اتنے دن سے میان میں پڑی پڑی زنگ آلودہ ہوی جاتی تھیں مختلف میدانوں میں چمکنے لگیں۔ اس علاقے کا یہی راجہ ہے جس نے شمال میں بنگالے تک یلغار کی اور تنجوری سواروں کے گھوڑوں کو گنگا کا پانی بلا دیا۔ یہ ۱۱۲۳ء کے قریب کا واقعہ ہے اور اس وقت بنگالے میں ہی پال فرماں روا تھا جسے راجندر نے شکست دی۔ مگر ایسی فتح کا کوئی دیرپا نتیجہ نہ نکل سکتا تھا اور اس راجہ کی بحری فتوحات کا بھی یہی حال ہوا کہ گو اس کے بیڑے نے جنوبی برما تک میں چولا خاندان کا جھنڈا گاڑ دیا لیکن وہاں زیادہ عرصے ان کا قبضہ نہ رہ سکا۔ البتہ راجندر کا ان کارناموں پر فخر کرنا کچھ بیجا نہ تھا چنانچہ گنگا تک فاتحانہ پیش قدمی کی یادگار ہی میں اُس نے ”گنگے گنڈ“ کا لقب اختیار کیا اور موجودہ ضلع ترچنا پلی میں ایک نئے پائے تخت کی بنیاد ڈالی جس کا نام ”گنگے گنڈ چولپورم“ تھا۔ یہاں اس کے تعمیر کردہ محل اور عالیشان مندر کے کھنڈر اب تک موجود ہیں ۶

راجندر کی وفات (۱۱۳۵ء) کے بعد اس خاندان میں

تیس پینتیس برس تک اندرونی فساد اور خانہ جنگیاں برپا رہیں۔ مگر گنت و خون کی داستان میں یا اس زمانے کی بیرونی لڑائیوں میں کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں البتہ جب اولاد نرینہ نہ ہونے کے باعث یہ ریاست راجندر اول کے نواسے کے ورثے میں آئی تو کہنا چاہئے کہ جنوبی ہند کے نصیب جاگ اٹھے؛

یہ راج کمار جس کی ماں ونگی کے چالوکی راجہ کو بیماری لگئی تھی، ایک طرف تو اپنے باپ کی ریاست (ونگی) کا مالک تھا اور دوسری طرف ریاست چولا اُسے ورثے میں مل گئی (سنہ ۱۰۰۰ء) اور آئندہ واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ نہ صرف اُس کی بلکہ اس تمام علاقے کی خوش قسمتی تھی؛ کیونکہ دونوں ریاستوں پر قبضہ ہونے کے بعد اس راجہ نے بیرونی فتوحات کے علاوہ اندرونی فتنہ و فساد سے رعایا کو نجات دلائی اور نظم و نسق میں مفید اصلاحیں کیں اور سنہ ۱۰۰۰ء میں مالگزار کی تشخیص اور زمین کی از سر نو پیمائش کرائی؛

کلوننگ چولا

۱۰۰۰ء یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ انگلستان کو جب ولیم (فاتح) نے فتح کیا تو اس کے حکم سے اُس ملک کی پہلی مرتبہ (اگرچہ کسی قدر ناقص) پیمائش اسی سال ہوئی تھی (سنہ ۱۰۰۰ء)

۱۰۰۰ء مسٹر کرشنا سوامی اینگرنے اس بات کی قدیم تحریری شہادت پیش کی ہے

بیتھو آئندہ

اس نے ”کلوننگ چولا“ کا لقب اختیار کیا تھا مگر وہ اور اس کی اولاد ”چالوکی چولا“ خاندان کے نام سے تاریخ میں موسوم ہے تاکہ ان میں اور اصلی چولا خاندان میں امتیاز رہے۔ ایک صدی سے زیادہ عرصہ تک جنوبی ہند میں ان کی سیادت قائم رہی اور عمدہ نظم و نسق کی بہ دولت ملک میں امن و امان و خوش حالی کا دور دورہ رہا۔ اس زمانے کے تمدن کا کچھ حل اگلی فصل میں ہماری نظر سے گزرے گا۔ واقعات تاریخی کے سلسلے میں یہاں یہ بتانا کافی ہے کہ تیرھویں صدی میں چالوکی چولا خاندان میں ضعف آگیا۔ ریاست پانڈیا کے خود مختار ہو جانے سے وہاں کے راجہ اور بھی کمزور ہو گئے اور آخر میں جب وجیا نگر کی نئی سلطنت نے سر اُبھارا تو ان کی سطوت کا آفتاب جو زوال کے درجے طے کر رہا تھا، غروب ہو گیا۔

پانڈیا اور چیرا

چولا خاندان کے انحطاط نے ریاست پانڈیا کو جنوب میں سب سے طاقتور بنا دیا تھا مگر اس کا یہ عروج زیادہ عرصے نہ رہا اور مسلمانوں کے دکن میں حملہ آور ہونے کے وقت وہاں کے راجہ رفتہ رفتہ اپنی خود مختاری کھو کر معمولی جاگیر دار رہ گئے۔ ان کی اس سے پہلے کی تاریخ میں ہمسائوں سے جنگ و جدال یا مذہبی کشت و خون کی خوفناک روایتوں کے سوا کوئی

بقیہ مضمون ص ۲۴۳

کہ جنوبی ہند میں اس قسم کی بیانیہں بہت پہلے سے رواج پا چکی تھیں، اس مضمون پر انکی کتاب ”این ریشٹ اٹیا“ کا چوتھا باب خاص طور پر قابلِ مطالعہ ہے۔ ص ۱۲

کار آمد بات نہیں ملتی۔ مگر ان مذہبی خوزریوں میں کم سے کم ایک واقعہ ذکر کے قابل ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں جب پانڈیا راجہ مدو مارن اپنی بیوی کے اثر سے جین مت چھوڑ کر شوجی کا معتقد ہوا تو اُس نے رعایا کو بھی اپنا نیا مذہب اختیار کرنے پر مجبور کیا اور منجملہ دیگر مظالم کے آٹھ ہزار جینیوں کی کھال کھجالی، جنھوں نے اپنا پرانا مذہب چھوڑنے سے انکار کیا تھا، شہر مدورا میں ”ات سو“ نامی تہوار جو ہر سال ہوتا ہے اسی اندوہناک واقعے کی یادگار ہے۔

جنوب کی دوسری ریاست چیرا کا ہمیں اس قدر حال بھی معلوم نہیں جس قدر کہ پانڈیا کا حال معلوم ہے۔ دوسرے یہ ریاست جس میں موجودہ ٹراونکور کا علاقہ شامل تھا، زیادہ تر چولا خاندان کے طاقتور راجاؤں کے ماتحت رہی اور اس لئے خاص وہاں کے واقعات کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

تیسری فصل - نظم و نسق اور فنون

نویں صدی سے چودھویں صدی کے آغاز تک کے جو کتبے جنوبی ہند میں دستیاب ہوئے ہیں ان سے ریاست چولا کے ملکی انتظامات کے متعلق بہت سی باتیں معلوم ہوئیں۔ اور

چونکہ اس ریاست کے فرماں روا بالواسطہ یا بلاواسطہ ایک حد تک تمام جنوبی ہند پر حکومت کرتے تھے لہذا ان کے آئین کو تمام جنوبی ہند کے آئین سمجھنا بے جا نہیں۔ ریاست چیرا کے جو کچھ بُرے پھیلے حالات معلوم ہو سکے ہیں ان سے بھی مذکورہ بالا قیاس کی تصدیق ہوتی ہے؛ البتہ یقین کے ساتھ یہ سراغ لگانا محال ہے کہ خود ریاست چیرا میں ان آئین کی ابتدا کی اور کیونکر ہوئی اور کس زمانے میں کیا کیا اصلاحیں عمل میں آتی رہیں؟

الغرض، مذکورہ بالا کتب سے جو کچھ معلوم ہو سکا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ گو جنوبی ہند کے دیہات میں بھی پنچایت کا طریقہ جاری تھا، لیکن یہاں بالعموم ہر گاؤں کی علیحدہ پنچایت نہ ہوتی تھی بلکہ بہت سے گاؤں مل کر ایک ”گورم“ کہلاتا تھا اور ہر گورم میں ایک ”ہاسیما“ یا مجلس ہوتی تھی جس کے اراکین قرعہ اندازی سے منتخب کئے جاتے اور ہر سال نیا انتخاب عمل میں آتا تھا۔ اس مجلس کو جو ایک حد تک سرکاری عمال کے ماتحت ہوتی تھی، اندرونی معاملات میں بہت کچھ اختیار حاصل تھے اور اس زمانے کی زبان میں، کہہ سکتے ہیں کہ پٹیل پٹواری کے فرائض وہی انجام دیتی تھی۔ گانوں والوں کے جھگڑوں کا فیصلہ اور آب پاشی کے تالاب، باغات وغیرہ کی عام نگرانی بھی اس سے متعلق تھی؛

ایسے کئی گورم مل کر ایک ضلع (”ناڈو“) اور چند اضلاع مل کر ایک قسمت (”گوٹم“) بنتی تھی تمام سلطنت کو

چھ صوبوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور ہر صوبے میں ایسی کئی کئی قسمیں (یا کوٹم) ہوتی تھیں؛ صوبے کی وسعت کا سرسری اندازہ کرنے کے لئے یہ لکھنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا کہ فاک ریاست چولا کا علاقہ ”چولا مندم“ کے صوبے میں داخل تھا اور وہ قریب قریب اس زمانے کے دو ضلعوں (یعنی تبنجور و تریچنالی) کے برابر ہے؛

بعض چھوٹے چھوٹے ابواب کے علاوہ، سلطنت گل پیداوار کا ایک سدس، مالیه وصول کر لیتی تھی اور اداے مالگزاری میں زمین دار کو اجازت تھی کہ زر نقد دے یا سرکاری مالیه جنس کی صورت میں ادا کر دے اور جو طلائی اشرفی، ریاست چولا میں رائج تھی اس کا وزن ساڑھے تین ماشے کے قریب تھا؛

معلوم ہوتا ہے کہ چولا خاندان کے راجہ وسائل آب پاشی پر سب سے زیادہ توجہ کرتے تھے۔ انہوں نے جو تالاب بنوائے اور بند باندھے ہیں، ان کے دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ تعمیر کے اس فن میں جنوبی ہند کے لوگ طاق تھے؛ بڑی بڑی چٹانوں کو بلندی پر چڑھانے اور جانے میں بھی انہیں کمال حاصل تھا چنانچہ تبنجور کے بڑے مندر کی چوٹی پر جو پتھر کی ڈال انہوں نے لگائی ہے اس کا وزن، تخمیناً دو ہزار من سے بھی کچھ زیادہ ہوگا؛ ونسٹ اسمتھ کا خیال ہے کہ اس قسم کی تعمیر میں بیگاریوں سے کام لیا جاتا ہوگا۔ لیکن رعایا کو

جیسی خوش حالی اور آزادی حاصل تھی، اُس کے اعتبار سے یہ
 نیال ہوتا ہے کہ ایسے کاموں میں وہ خوشی سے شریک ہو
 جاتی ہوگی۔ کیونکہ ان میں سے اکثر عمارتیں اگر اس کے فائدے
 کی نہ تھیں تو کم سے کم اس کے مذاق کے موافق ضرور تھیں؛
 ”جنوبی ہند کے فنون کی تاریخ خاص طور پر اس لئے
 قابل مطالعہ ہے کہ یہاں اُن پر بیرونی ممالک کا اثر نہ پڑا تھا
 بلکہ ان کی ابتدا اور آئندہ جو کچھ ترقی ہوئی وہ سب اپنے وطن
 میں ہوئی۔ فنون سے یہاں صرف عمارت و سنگ تراشی مراد
 ہیں کیونکہ نقاشی کا کوئی خاص نمونہ باقی نہیں رہا۔ چونے
 یا لکڑی پر قدیم زمانے میں جو نقش و نگار بنائے گئے ہوں گے،
 ان کا اب کوئی نشان نہیں ملتا اور اس لئے اس کے متعلق ہم
 کچھ بیان نہیں کر سکتے۔ لیکن اس میں کوئی کلام نہیں کہ یہ فن
 اور اس کے بہت سے نمونے موجود ہوں گے جن سے آئندہ
 سنگ تراشی کے کام میں مدد ملی؛ وہ کاریگر جنھوں نے پلوی
 راجاؤں کے مندروں کا نقشہ بنایا اور مائل پورم کی چٹانوں پر
 سنگ تراشی کا کمال دکھایا، کسی طرح نو آموز نہ تھے۔ بلکہ درحقیقت
 دوسری قسم کے مسالے پر ایسے کام عرصہ دراز سے وہاں ہوتے
 رہے تھے اور نسل با نسل کا تجربہ انہیں میراث میں پہنچا تھا
 جس کے زور پر انہوں نے بوقت ضرورت پتھر پر اپنی کاریگری
 کے جوہر دکھائے؛ یہ بھی ثابت ہے کہ عہد چولا کی صناعی کا
 سلسلہ پلوپول کے زمانے سے جا ملتا ہے اور دونوں کے

بیچ میں کوئی بڑا فصل نہیں۔ پس بعد کے جو نمونے ہمارے سامنے ہیں وہ تدریجی ترقی کا نتیجہ تھے، عہد چولا کا سب سے پرانا مندر، جس کی حسن و خوبی پر اس زمانے کے مبصروں نے تفصیل سے بحث کی ہے، دادپورم (ضلع ارکاٹ جنوبی) میں واقع ہے اور دسویں صدی عیسوی میں بنایا گیا تھا، لیکن اس زمانے کی سب سے اچھی عمارتیں تجور اور گنگے گنڈجولا پورم کے مندر ہیں جن کے بلند اور خوش نما منارے ساری عمارت میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ بعد میں اصل عمارتیں بہت حقیر بننے لگی تھیں اور ساری محنت احاطے کے بیرونی ”گوپورم“ (یا ڈیوڑھی) کی تیاری میں صرف کر دی جاتی تھی جیسا کہ چٹم برم کے مندر میں کیا ہے۔ اور گو اس تدبیر سے عمارت کی ظاہری رفعت و شان بڑھ جاتی ہے۔ لیکن پوری عمارت دیکھ کر کچھ دل خوش نہیں ہوتا x x x “

(اوکس ہس ۲۱۳)



غلط نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	حاشیہ زیرین	سند رام	سند روم
۶	آخری سطر	”راج ترنجینی“	ہر جگہ اس لفظ کا دوسرا اور تیسرا تلفظ ”راج تر کننی“ بنا لیا جائے۔
۳۰	عنوان حاشیہ	مکانات کا	مکانات کی
۴۲	۱۶	مرتبہ اسے	مرتبہ انسان کو
۴۵	حاشیہ زیرین	مغرب ہمسایہ	مغرب کے ہمسایہ
۴۶	عنوان حاشیہ	”اصول و عقائد“	(یہ عنوان چند سطریں نیچے ہونا چاہئے)
۴۸	حاشیہ زیرین سطر	آوف	آوف
۵۸	۸	ياسوج	یا ”سورج
۶۲	حاشیہ سطر ۴	ستی کی راسم	ستی کی رسم
۴۳	۱۰	تائید چاہنا	تائید چاہنی
۸۶	۱	گھر	گھرا
=	حاشیہ	بجے نگر	وجیا نگر
۱۱۶	۵	”غیر	غیر
۱۱۹	حاشیہ	شمال مغربی	شمال مغربی
۱۴۵	۱۳	شہرب	شہراب
۲۱۹	۱	سین	سینین

